آج کل

مارچ 2019 -/22₹

اردو کا بین الاقوامی ادبی اور ثقافتی ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ISSN 0971 - 846 X

ایڈیٹر

حسن ضیاء

فون:011-24369189

ڈاکٹر ابرار رحمانی

جلد:77 شمارہ:08

مارچ2019 ماگھ۔ پھالگن شک1940

کمپوزنگ : آئی احمد

سرورق : انکورورما

جوائنٹ ڈائریکٹر (پروڈکشن): وی کے مینا

آجکل کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

فی شمارہ:22روپے سالانہ:230روپے

دوسال: 430روپے تین سال:610روپے

امریکہ، یورپ اور دوسرے ممالک کے لیے بذریعہ ہوائی ڈاک سالانہ730روپے

پڑوسی ممالک کے لیے بذریعہ ہوائی ڈاک: سالانہ530روپے

خریداری واشتہار کے لیے منی آرڈر، ڈرافٹ اور پوسٹل آرڈر

DG, Publications Division کے نام اس پتہ پر بھیجیں:

بزنس منیجر

جرنلس یونٹ، پبلی کیشنز ڈویژن، روم نمبر56، سوچنا بھون

سی جی او کمپلیکس، لودھی روڈ، نئی دہلی110003

فون نمبر: 011-24365609

رسالے کی عدم دستیابی سے متعلق شکایتیں بزنس منیجر

کو مندرجہ ذیل آئی ڈی پر میل کریں

pdjucir@gmail.com

مضامین/تخلیقات سے متعلق رابطے کا پتہ:

ایڈیٹر 'آجکل' (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، A-601، سوچنا بھون

سی جی او کمپلیکس، نئی دہلی۔110003

Website: www.publications division.nic.in

E-mail: ajkalurdu@gmail.com

ترتیب

اداریہ : تانیثیت: کل اور آج — حسن ضیاء — 4

مقالات:

تانیثی تنقید: ایک جائزہ — غزالہ فاطمہ — 5

زہر عشق اور لکھنوی تہذیب — جنتی جہاں — 8

بھوپال کی چار باکمال بیگمات — مہتاب جہاں — 11

ظریفانہ ادب میں نسوانی کردار — ڈاکٹر حلیمہ فردوس — 14

اردو داستانوں میں زنانہ منفی کردار کی فعالیت — رئیس فاطمہ — 19

ڈاکٹر عابد حسین کی ایک غیر مطبوعہ تحریر — عذرا نقوی — 22

یاد رفتگاں

اقبال مجید کا 'خاموش مکالمہ' — محمد غالب نشتر — 27

افسانے:

وہ تیرہ قدم — قمر جمالی — 30

رشتوں کی کربلا — رینو بہل — 34

مجھے بھی — غزالہ قمر اعجاز — 37

ہم سخن تیری خاموشی ہے ابھی..... — رخشندہ روحی مہدی — 40

منظومات:

پروفیسر آصفہ زمانی، عذرا نقوی، کوثر جہاں — 44

خوشبو پروین، عالیہ، شاذیہ عمیر — 45

ڈاکٹر رضوانہ ارم، عمرانہ خانم، استوتی اگروال — 46

تبصرے: — مبصر — 47

بھولے بسرے مجاہدین/نند کشور وکرم — خالد اشرف

بے کرانیاں/ پروین شیر — محمد نوشاد عالم ندوی

ہم تم دوست ہوئے/منصور صفدر نقوی — علی ظہیر نقوی

نیا دور: مجتبیٰ حسین نمبر/ایڈیٹر: — ڈاکٹر فیروز عالم

مراسلات: — 50

حرف آخر: سوشل میڈیا کے لٹکے جھٹکے — ڈاکٹر ابرار رحمانی — 54

تانیثیت: کل اور آج

عالمی یوم خواتین کے حوالے سے ماہنامہ 'آجکل' اپنا مارچ کا شمارہ تانیثیت کے موضوع اور خواتین قلم کاروں کی نگارشات کے لیے مخصوص رکھتا ہے۔ بطور منظّم تحریک تانیثیت کی ابتدا انیسویں صدی میں ہوئی جب خواتین کے لیے ووٹ دینے کے حق کے لیے جدوجہد شروع ہوئی۔ مغرب میں اس سیاسی تحریک کی پیش قدمی اپنے سماجی مضمرات سے خالی نہیں تھی۔ بالآخر ادب میں بھی اس رجحان نے زور پکڑا۔ انگریزی ادب میں تانیثیت کو سب سے بڑا پلیٹ فارم، فکشن نے فراہم کیا۔

انگریزی کے فکشن نگاروں کے یہاں تانیثیت کا رجحان انیسویں صدی کے نصف میں شروع ہوا۔ شیرلٹ، برونٹے، ورجینیا وولف، نیٹ ونٹرسن اس کی مثالیں ہیں۔ وکٹورین انگلستان کے مشہور ناول نگار تھومس ہارڈی کو ہم اس کی بے باک حقیقت نگاری کے لیے جانتے ہیں۔ ہارڈی کے بعض نسوانی کردار اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔

انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں جب انگریزی ادب زور وشور سے تانیثیت کے رجحان کو فروغ دے رہا تھا تو اردو معاشرے کے اپنے تحفظات کے سبب ڈپٹی نذیر احمد اور ان کے معاصرین کے یہاں بات اصلاح معاشرہ سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ لیکن پریم چند سے لے کر عصمت چغتائی اور رشید جہاں کا دور آتے آتے تانیثیت، ایک پرزور تحریک بن گئی۔

تانیثیت کو نظریاتی سطح پر تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ لبرل فیمنزم، مارکسی یا سماج وادی فیمنزم اور انتہا پسند فیمنزم۔ اس تحریک نے گزشتہ دو سو ڈھائی سو برس کے دوران ایک طویل سفر طے کیا ہے۔ اس تحریک کی سیاسی، سماجی اور ادبی تاریخ سے قطع نظر دو حقائق دلچسپ اور قابل غور ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ مغرب میں فیمنزم لفظ، ابتدا میں طب کی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ دوسری یہ کہ جب انسان تہذیب کے دور میں داخل نہیں ہوا تھا اور جنگلوں میں بسیرا کرتا تھا تو مرد وزن کے درمیان اس تفریق کی شکایت نہیں تھی جو انسان کے 'مہذب' ہونے کے بعد سامنے آئی۔

ہندوستان کی تحریک آزادی نے خواتین کی مساوات کے مطالبہ کی نہ صرف پرزور حمایت کی بلکہ عملاً بھی اس اصول کو اپنایا۔ اس کا ثبوت جنگ آزادی میں خواتین کی سرگرم شرکت ہے۔ ہمارے آئین نے بھی جنس، مذہب وملت اور رنگ ونسل کی بنیاد پر انسان اور انسان میں تفریق برتنے کے نظریہ کو یکسر مسترد کر دیا۔ لیکن قانون کے آدرشوں کے سماجی حقیقت بننے میں دشواریاں بھی آتی ہیں اور وقت بھی درکار ہوتا ہے۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے۔ تعصّبات اور تفریق کی فضا بدلنے کے لیے سماج کو خود کو تیار کرنا ہوتا ہے۔ آج سماجی تبدیلی کے عمل کے مثبت اثرات دنیا بھر میں سامنے آرہے ہیں۔ مساوات پر مبنی اور تفریق، تعصب اور تنگ نظری سے پاک معاشرے کی تعمیر وتشکیل کا خواب اور تصور، ناقابل عمل نہیں ہے۔ سماج کا ذہن بدلنے میں اکثر وقت لگتا ہے۔ تانیثیت کی تحریک اکثر وبیشتر انتہا پسندی کا شکار بھی ہوئی ہے اور اپنی منزل مقصود کے تعین میں تہذیب وشائستگی کے حدود سے تجاوز کرتی بھی نظر آئی ہے۔ آزادی ومساوات کے بغیر ہم مہذب معاشرے کا تصور نہیں کر سکتے لیکن قانون اور اخلاقیات دونوں ہی کسی بھی آزادی کو بے لگام نہیں چھوڑ سکتے۔ ہر آزادی معاشرے کے اجتماعی مفادات کے تحت ہی ہوتی ہے۔

اس شمارہ میں تانیثیت اور خواتین کی صلاحیتوں کے حوالے سے جو مضامین شامل ہیں ان میں تانیثی تنقید پر مضمون میں تانیثیت کی مختلف تعریفوں پر گفتگو کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تانیثیت کے رجحان کی دو سو سالہ تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اس کی مختلف شکلیں نظر آتی ہیں۔ آج تانیثیت ایک کثیر الجہت رجحان بن چکا ہے۔ اس کو کسی ایک تعریف میں قید کرنا آسان نہیں رہا ہے۔ بھوپال کی بیگمات پر مضمون سابق ریاست بھوپال کی خواتین فرمان رواؤں کی انتظام وانصرام کی صلاحیتوں کا احاطہ کرتا ہے۔ ان خواتین نے جنگ وجدل، فن تعمیر، تعلیم، ہر شعبہ میں اپنے وژن کا ثبوت دیا ہے اور وہ بہترین منتظمہ کی مثال تھیں۔ ظریفانہ ادب میں نسوانی کرداروں پر مبنی مضمون اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ طنز ومزاح خواہ نظم میں ہو یا نثر میں، خواتین اس کا موضوع بھی رہی ہی اور انہیں ہدف طنز و مزاح بھی بنایا گیا ہے۔ مزاح سے لطف اندوز ہونے کے لیے حس مزاح بھی ضروری ہے لہٰذا طنز و مزاح کا مطالعہ اسی جذبے سے کیا جانا چاہئے۔ اردو داستانوں میں میں زنانہ منفی کردار کی فعالیت عنوان کے تحت مضمون میں مثبت اور منفی رول ادا کرنے والے کرداروں کے فرق کو واضح کرتے ہوئے داستانوں میں زنانہ منفی کرداروں کی اہمیت اور اثر کی نشاندہی کی گئی ہے۔

اس شمارہ میں شامل افسانوں اور حصہ نظم دونوں میں ہی صرف خواتین افسانہ نگاروں اور شاعرات کو ہی جگہ دی گئی ہے۔

ادب کی دنیا میں خواتین کی شرکت بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ اردو ادب کے قارئین میں خواتین ہمیشہ سے بڑی تعداد میں شامل رہی ہیں۔ بحیثیت قلم کار بھی ان میں سے بیشتر کی اپنی الگ پہچان رہی ہے۔ یہ سلسلہ رکنا نہیں چاہئے۔ خواتین کے احساسات، تاثرات اور فکر وخیال کو ادب کا حصہ بنائے بغیر ہمارا ادب ادھورا ہی رہے گا۔ تانیثیت کے رجحان اور اس کے مختلف پہلوؤں پر غور وفکر کے لیے خواتین قلم کاروں کی تحریریں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

حسن ضیاء

غزالہ فاطمہ

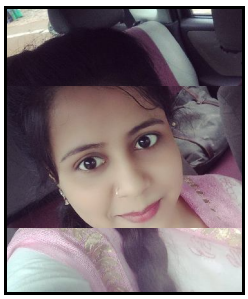

تانیثی تنقید: ایک جائزہ

لفظ تانیثیت عربی زبان کے لفظ 'تانیث' سے نکلا ہے جس کے لغوی معنی مونث کی علامت لگانا ہے ۔تانیثیت انگریزی لفظ فیمنزم (Feminism) کی اردو اصطلاح ہے۔Feminism لاطینی زبان کے لفظ Femina سے مشتق ہے۔Femina کے معنی عورت ،عورتوں کا وغیرہ اور ism سے مراد 'نظریہ' کے ہیں یعنی فیمنزم کے معنی تانیثی نظریہ یا تانیثیت کے ہیں۔مختلف دور میں تانیثیت یاFeminism کی مختلف تعریفیں وضع کی گئی ہیں۔مغرب میں بھیFeminism کی مکمل اور جامع تعریفیں ملتی ہے۔فیمنزم کا تعلق تحریک نسواں سے ہے۔کبھی اسے عورتوں کا نظریہ کہا گیا تو کبھی عورتوں کی حمایت کرنے والوں سے جوڑا گیا۔ہندی والوں نے اسے ناری آندولن،استری ومرش جیسے نام دیے اور اردو ادب میں بھی اس کے لیے بہت سے نام وضع کیے گئے۔مثال کے طور پر حقوق نسواں،آزادی نسواں،تانیثی تحریک اور تانیثیت وغیرہ۔

تانیثیت سے مراد ایک ایسا رجحان،فکر یا تحریک ہے جو مرد اساس معاشرے میں عورتوں کی زندگی کو ہدف ملامت بنانا،سماج میں مرد کی برتری یا مرکزیت اور عورت کی ثانویت،عورت کے سیاسی ،معاشی اور جنسی استحصال سے لے کر جبر وزیادتی،عدم تحفظ،غیر مساوی حقوق وغیرہ کے تمام مسائل پر بحث کی جائے۔تانیثیت ایک ایسا فکری تصور ہے جو طبقہ نسواں کے بیشتر پہلوؤں مثلاً سماجی، سیاسی، اقتصادی،اخلاقی، مذہبی، تعلیمی اور معاشرتی زندگی کو اجاگر کرتا ہے۔تانیثیت کے بارے میں پروفیسر نارنگ لکھتے ہیں۔

''تانیثیت ،تاریخی،ادبی اور ثقافتی متون کی از سرِ نو تشریح وتعبیر کر کے عورت کو نہ صرف اس کا صحیح مقام دلانا چاہتی ہے بلکہ وہ گذشتہ اور موجودہ متون میں عورت کے نقطہ نظر کے اظہار کی کمی کی تلافی بھی کرنا چاہتی ہے۔''

(پروفیسر گوپی چند نارنگ،جدیدیت کے بعد،ص216)

اس کا تصور بہت وسیع ہے جس میں مرد عورت کی زندگی کے ایسے خارجی وداخلی راز پوشیدہ ہیں جو اس فکری تصور کو ایک توانائی فراہم کرتے ہیں۔تانیثی تحریک عورتوں سے متعلق ان تمام مروج نظام ،اخلاق وتہذیب پر ایک کاری ضرب لگاتی ہے اور اس کے خاتمے کے لیے مردوں وعورتوں کے باہمی شعوری عمل کی خواہاں ہے۔قاضی افضال حسین نے تانیثیت کی تعریف اس طرح بیان کی ہے:

''معاشرے کی تشکیل کے لیے عورت اور مرد دونوں ضروری ہیں لیکن ان کے درمیان ربط کی نوعیت ایک مخصوص معاشرے کی معاشی اور تہذیبی ضرورتوں سے متعین ہوتی ہے۔بیش تر معاشروں میں مرد اور عورت کا یہ تعلق ترجیحی نوعیت کا ہے۔یعنی مرد ایک طاقتور فاعل،حاکم ،اور معاشرے میں اقتدار کا ماخذ اور منصرم ہے جب کہ عورت کمزور ،محکوم اور معاشرے کی مرکزی ضرورتوں کو پورا کرنے والی مفعول یا معروض ہے۔تانیثیت کی سیاسی اور سماجی تحریکات کے لیے یہ غیر مساوی معاشرتی/معاشی نظام ہی ان کی جدو جہد کا اصل موضوع ہے۔''

(متن کی تانیثی قرأت،قاضی افضال حسین،ص۴۷)

تانیثیت کے آغاز وارتقاء کی اگر بات کی جائے تو اس سے پہلے وہ وجوہات ومسائل ذہن میں گردش کرنے لگتے ہیں جنھوں نے تانیثی فکر کو جنم دیا۔عورت صدیوں سے اس پدری سماج میں مظلومیت اور محرومیت کا شکار ہوتی رہی ہے۔عورتوں پر زمانۂ قدیم سے ہی ظلم وستم اور جبر واستبداد کی روایت چلی آرہی ہے۔مرد اساس معاشرے نے عورت کا جب اور جس طرح سے چاہا استحصال کیا۔عورتوں کو اس قدر محکوم ومجبور بنا دیا گیا کہ وہ صحیح اور غلط میں فرق کرنے سے عاری ہوگئی۔جب قدیم عبادت گاہوں میں عورت کا نیا روپ دیوداسی کے طور پر وجود میں آیا تو اس بات کی بھی وضاحت کی گئی کہ ہر عورت اپنی زندگی میں کم از کم ایک بار دیوی کو خوش کرنے کے لیے اپنی عصمت پجاریوں اور مسافروں کے لیے قربان کرنا باعث فخر سمجھے۔اس وقت حالات یہ تھے کہ ان دیوداسیوں کو معاشرے میں بڑی عزت واحترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔یہاں یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس مرد اساس معاشرے نے کس قدر عورت کا Brain wash کر دیا تھا کہ وہ اپنی خوشی سے اپنی عصمت ان سماج کے ٹھیکیداروں کے ہاتھوں میں سونپ دیتی تھی۔مردوں نے جس طرح چاہا عورتوں کو استعمال کیا ۔لیکن جب پانی سر سے اوپر ہو گیا تو عورت،مرد غالب معاشرے کے وضع کردہ اصولوں سے بغاوت کرتے ہوئے ایک نئی دنیا کی (جس میں مرد آقا نہیں ہوگا اور عورت غلام نہیں) تعمیر و تشکیل کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔عورت کا یہ جذبہ احتجاج اس وقت تحریک کی شکل اختیار کر لیتا ہے جب مرد اساس معاشرے کا ظلم ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔یوں تو عورتوں پر ظلم وجبر کی روایت بہت پرانی ہے۔لیکن اس کی طرف لوگوں کی توجہ بہت دیر سے گئی۔اسے عورتوں کی سادہ لوحی کہیے یا مردوں کی بے حسی کہ عورتوں کے استحصال کے بارے میں کسی نے سوچا ہی نہیں،خود عورت نے بھی اسے کبھی محسوس نہیں کیا اور دھیرے دھیرے اس روایت کی جڑیں مضبوط ہوتی گئیں۔بقول ڈوروتھی ڈنرسٹین (Dorothy Dinnerstain) 'مرد نے کبھی عورت کو انسان سمجھا ہی نہیں'۔اپنے اوپر ہو رہے جبر سے عورت نے پہلی بار بغاوت کب کی،اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔لیکن سویڈش قلمکار Ellen Karolina Sofia

ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ،نئی دہلی110025
فون:7530972798 ghazalaamuu@gmail.com

Key کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے نسائی تحریک کی شروعات تب ہوئی جب حوّا نے شجرِ ممنوعہ کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ یعنی عورت کا اپنے محدود دائرے سے تجاوز کرنا ہی نسائی تحریک کی ابتدا تھی۔ کیوں کہ اس کے لیے یہ حدود مردوں نے ہی طے کیے تھے۔ اس کے باوجود بھی عورتوں نے ہر دور میں اپنی ذاتی صفات کا کھل کر اظہار کیا۔ کبھی وہ جاں باز سپاہی تو کبھی حکمراں کی صورت میں سامنے آئی۔ اس مرد اساس معاشرے نے ان کی ان صلاحیتوں کو 'مردانہ' کہہ کر خوب سراہا۔ کیا یہ ان عورتوں کے ساتھ انصاف ہو رہا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ ان کرداروں کو نباہتے ہوئے بھی عورت صرف اور صرف عورت ہی تھی ہر حال میں عورت۔ شجرِ ممنوعہ کی طرف ہاتھ بڑھانا ہی عورت کی پہلی بغاوت تھی۔ اگر ہم غور کریں تو دورِ قدیم سے ہی عورتوں کی صلاحیت اور استطاعت کے بارے میں دیگر فلسفیوں کی رائے کچھ بہتر نہ تھی۔ عورتوں کے تعلق سے پہلی رائے یونان کے مشہور مفکر ارسطو نے پیش کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ عورت کی پیدائش ہی محکومیت کے لیے ہوئی ہے اور اس کا کام مرد کی تابع داری ہے۔ وہ اپنی کتاب Politics میں لکھتا ہے:

"The courage of a man is shown in commanding,of a women in obeying."

ارسطو کے مطابق عورت کی محکومیت کا مطلب تھا اس کا چپ رہنا، شوہر کی فرماں برداری کرنا اور محبت پانے سے زیادہ محبت دینا۔ کئی صدیاں گزرنے کے بعد اطالوی مفکر، پادری اور ماہر دینیات Thomas Aquinas نے بھی ارسطو کے نظریے کی تائید کی۔ اس کا کہنا تھا کہ عورت مرد کے مقابلے میں کمتر ہے جب کہ مرد اس سے زیادہ طاقتور ہے۔ چونکہ عورتیں گناہ کا سبب بنتی ہیں اس لیے سماج میں انھیں محکوم کی حیثیت سے رہنا پڑتا ہے۔ عورت کی ضرورت اور مدد مرد کو اس وقت پیش آتی ہے جب مرد کو افزائش نسل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

فرانسیسی مفکر روسو جس کے خیالات نے فرانس میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔ وہ بھی عورتوں کے متعلق دقیانوسی سوچ رکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ عورتوں کا محکوم ہونا ایک فطری بات ہے۔ وہ محکوم اس لیے ہے کہ وہ ماں ہے۔ وہ مرد کے بغیر اولاد پیدا نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ سماج میں وہ ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ روسو یہ بھی کہتا ہے کہ بہتر سماج کے لیے ضروری ہے کہ عورت اپنی جنسیت پر قابو رکھے اور شرم و لحاظ کی پابند رہے۔ روسو لکھتا ہے:

"She must be modest, devoted, retiring, she should have the witness not only of the good conscience but of a good reputation."

روسو عورتوں کے متعلق مردوں کے بنائے ہوئے تمام اصولوں کی حمایت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مرد کے گناہوں کی بھی کوئی نہ کوئی توجیہہ پیش کرتا ہے۔ وہ مرد کی بے وفائی کو جائز مانتا ہے لیکن عورت سے پوری وفا کی امید رکھتا ہے۔ وہ عورت کی بے وفائی کو ناقابل معافی مانتا ہے۔ وہ تو عورتوں کو مردوں کے برابر تعلیم دینے کے بھی حق میں نہیں تھا۔ اس کا ماننا تھا کہ جب عورت مرد ایک جیسے نہیں ہیں تو ان کی تعلیم بھی ایک جیسی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ عورت کی تعلیم مرد سے جڑی ہوئی ہونی چاہئے۔ عورت کی زندگی کا مقصد مرد کی خوشنودی ہے۔ جب روسو جیسا بڑا مفکر عورتوں کے حقوق کے بارے میں نہیں سوچ سکتا تو عام لوگوں سے کیسی امیدیں لگائی جاتیں۔

ہندوستان جیسے قدیم ترین مہذب ملک میں جہاں دیوتاؤں کے ساتھ دیویوں کی بھی پوجا کی جاتی ہے۔ وہاں بھی عورتوں کی حالت بہتر نہ تھی۔ وہ بھی عورتوں کے لیے تنگ نظر رہا ہے۔ یہاں تک کی اس کے وجود کی نفی کی گئی۔ اسے سیکنڈ سیکس کے طور پر دیکھا گیا۔ ہندوستانی تاریخ کے غائر مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ ویدک دور میں عورتوں کی قدر کی جانے لگی تھی۔ انھیں سپہ گری کی تعلیم دی جانے لگی لیکن باوجود اس کے انھیں جنگ کے لیے مناسب تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ بیٹی کے بجائے بیٹے کی خواہش کا اظہار ملتا ہے۔ Women in Rig veda میں اُپادھیائے کا کہنا ہے کہ 'یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ رگ وید میں بھی لڑکیوں کے جنم کی کوئی خواہش نہیں دکھائی گئی..... اور اتھر وید میں بھی لڑکیوں کی پیدائش کو کم یا نظر انداز کیا گیا'۔

اس کے بعد بدھ مت کا بول بالا ہوا۔ بدھ مت کے فروغ کے ساتھ ہی عورتوں کی حالت میں سدھار پیدا ہوا۔ برہمنوں نے طبقاتی تقسیم کے بنا پر عورتوں کی جو حالت کر رکھی تھی گوتم بدھ نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور عورتوں کو آزادی دلائی۔ گوتم بدھ معاشرے میں ایسی عورت کی خواہش کرتے ہیں جو پڑھی لکھی ہو، اسے شاعری آتی ہو اور شاستروں کے قوانین سے بھی واقفیت رکھتی ہو۔ گوتم بدھ نے ویدک عہد کی روایات کو زندہ ہی نہیں کیا بلکہ اس سے بڑھ کر عورتوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ بھی دی۔ عورتوں کی تعلیم و تربیت کی ابتدا گوتم بدھ کی مرہون منت ہے۔ اشوک کے عہد سے لے کر ہرش وردھن تک عورتوں کو پڑھنے اجازت تو تھی لیکن لکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ بدھ مت کے زوال کے بعد بھی عورتوں کا تعلیمی سلسلہ جاری رہا۔ گپت عہد میں عورتوں کو تحریر سے بھی واقفیت حاصل ہوئی اور انہیں اسٹیج پر اداکاری کی بھی اجازت تھی۔ کالی داس نے اپنی تصنیفات میں تعلیم یافتہ باشعور عورتوں کے کردار پیش کیے ہیں۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ کے نمونے گپت عہد کی تصنیفات میں دستیاب ہیں۔ جن سے ہمیں عورتوں کے اس زمانے کے حالات کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً قدیم ہندوستان میں عورتوں کا جائداد میں کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا خاص کر شوہر کی جائداد میں بیوی کا۔ اپنے وقت کے مشہور قوانین داں اور 'منوسمرتی' کے خالق منو عورتوں کو ہمیشہ مردوں کے زیرِ نگیں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ''ایک عورت کا بچپن میں باپ کا، جوانی میں شوہر کا اور شوہر کے مرنے کے بعد بیٹے کا محکوم ہونا ضروری ہے۔ وہ کبھی آزاد نہیں ہو سکتی۔''

مختلف حالات کے تحت دنیا کے مختلف ممالک میں تانیثیت کی ابتدا ہوئی۔ دنیا کے بیشتر ممالک میں عورتوں کی حیثیت محکوم کی سی تھی۔ عورتوں کو اپنے جائز حقوق سے محروم ہونے کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کو بھی ظاہر کرنے کی اجازت نہ تھی اور نہ ہی انھیں بحیثیت انسان اپنی خواہشات کے اظہار کے مواقع حاصل تھے۔ رفتہ رفتہ عورتوں کی اس محرومی کے خلاف احتجاج شروع ہوا۔ جن میں صرف عورتیں ہی شامل نہیں تھیں بلکہ مرد بھی شامل تھے۔ جنھیں عورتوں کی زبوں حالی کا احساس ہونے لگا تھا۔ عورتوں کے حقوق کے لیے آوازیں بلند ہونے لگیں، تعلیم، روزگار، شادی بیاہ، حمل، اسقاط حمل اور جنسی آزادی پر عورتوں کی رائے ضروری سمجھی جانے لگی۔ عورتوں نے رائے دہندگی کے لیے بھی آواز بلند کی اور سماج میں اپنی شخصی آزادی کے لیے سرگرداں ہو گئیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے تانیثیت نے ابتدائی مراحل سے ہی تحریک کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تانیثیت بحیثیت تحریک سب سے پہلے مغربی ممالک میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ مغربی مصنفین تانیثی تحریک کو کئی ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ یہ تقسیم تانیثی تحریک کے بدلتے ہوئے انداز و اطوار کو دیکھتے ہوئے عمل میں آتی ہے۔ تانیثیت مغرب سے شروع ہو کر دھیرے دھیرے پوری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ ڈاکٹر ندیم احمد اپنے ایک دیباچے میں لکھتے ہیں۔

''مغرب میں تانیثی عناصر، رجحانات و تحریکات کی ابتدا 19-20 جولائی 1848 میں Seneca Falls,Newyork,America میں چار بچوں کی ماں Elizabeth

Cady Stanton نے تقریباً ایک سو ستر سال قبل خواتین کے کانفرنس میں کیا تھا۔ لیکن جب ہم برصغیر ہندو پاک میں یا اردو میں خواتین کے ادب اور خاص کر شاعری پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو ان کے یہاں رومانی اور تقلیدی شاعری ہی نظر آتی ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول اور بعد کی ادیباؤں میں یہ فرق نمایاں نظر آتا ہے۔ آزادی کے بعد ادیباؤں اور شاعرات نے فنی وفکری ہر دو سطح پر نئی آنے والی تبدیلیوں کو محسوس بھی کیا اور قبول بھی کیا۔''

اسلام سے قبل عرب ممالک میں عورتوں کی سماجی حالت بہت خراب تھی۔ اس کے حقوق کو نہ صرف پامال کیا گیا بلکہ اس کے ساتھ وحشیانہ سلوک روا رکھا گیا۔ قدیم عرب میں جہالت کا یہ حال تھا کہ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ عرب سماج میں عورت ایک جائداد کی حیثیت رکھتی تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد اسے فروخت کر دیا جاتا تھا۔ اتنا ہی نہیں سوتیلی ماں سے شادی کرنے اور اپنی بیوی کو ایک خاص عرصے تک دوسروں کو کرائے پر دینے کی رسم بھی موجود تھی۔ اسلام سے قبل عورت بے بسی اور مظلومی کی تصویر تھی۔ دور جاہلیت میں عورت کی شادی کے چند مختلف طریقے رائج تھے۔ عورت محض جنسی تسکین کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ عورت ہر طرح کے ظلم واستبداد کی شکار تھی۔ اسے کوئی بھی سماجی اور ازدواجی حقوق حاصل نہیں تھے۔ لیکن جب اسلام کا ظہور ہوا تو آہستہ آہستہ عورت کی عظمت کا احساس دلایا اسے جاہلیت سے نکال کر اعتدال پسند آزادی کی طرف لا کھڑا کیا۔ عہد رسالت میں عورت کو صدیوں سے مرد کی غلامی اور اس کے جبر و استحصال سے چھٹکارا حاصل ہوا۔ بیٹیاں جو مردوں کی نظر میں حقیر و ذلیل اور باعث ننگ و عار سمجھی جاتی تھیں اب بیٹیوں کو بھی بیٹوں کی طرح اسلامی حیثیت کے مطابق تعلیم وتہذیب سے آراستہ کیا جانے لگا۔ اسلام میں عورت کو وہ تمام حقوق حاصل ہو گئے جن سے وہ کئی صدیوں سے محروم تھی۔ عورت اپنے مال کی حق دار اور مالک قرار دی گئی۔ اسے اپنے خاوند سے مہر وصول کرنے کے پورے اختیارات دیئے گئے۔

تانیثی تنقید ایک طرح کی ادبی تنقید ہے جس کا تانیثی ڈسکورس سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ ہندوستان میں تانیثی تنقید کا وجود باقاعدہ طور پر تو موجود نہیں ہے لیکن مغرب کے حوالے سے بات کریں تو اس کا تاریخی پس منظر بہت وسیع ہے۔ ابتدائی دور میں تانیثی تنقید ادب میں صرف عورتوں کی حالت اور ان کے کردار وعمل کی عکاسی تک محدود تھی، لیکن رفتہ رفتہ اس میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہوئیں۔ 90 کی دہائی کے آس پاس جنس (Gender) سے متعلق زیادہ پیچیدہ تصورات فروغ پانے لگے اور اسی زمانے میں تانیثی تنقید ایک نیا موڑ اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ادب میں تانیثی تنقید کے چند مقاصد ہیں جن میں تانیثی ادبی روایت کا قیام خاص اہمیت کا حامل ہے، تاکہ اس کی بنیاد پر ادبی تاریخ میں خواتین ادیبوں کے مقام کو واضح کیا جا سکے۔ اس کے لیے قدیم ادبی متون کی از سر نو دریافت کو لازم قرار دیا گیا۔ تانیثی ناقدین کا کہنا ہے کہ خاتون ادیباؤں کو ادبی تاریخ سے یا تو خارج کر دیا گیا ہے یا انھیں حاشیے پر لا کر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اس لیے جب تک ان کی اپنی ادبی شناخت قائم نہیں ہو جاتی، تب تک ان کی ادبی حیثیت کو نظر انداز کیا جاتا رہے گا۔ چنانچہ تانیثی تنقید خواتین تخلیق کاروں کی ادبی شناخت کی ضرورت کو شدت سے محسوس کرتی ہے۔ یہاں یہ بات باور رہنا چاہئے کہ پہلے خواتین ادیباؤں کو اپنے اصلی نام سے اپنی تخلیقات شائع کرانے میں تامل محسوس ہوتا تھا۔ کیونکہ ان کی ادبی روایت کا فقدان تھا۔ تانیثی تنقید کے مقاصد میں یہ بھی شامل ہے کہ خواتین ادیباؤں کا اور ان کی تخلیقات کا مطالعہ تانیثی تناظر میں کیا جائے اور ادب میں جنس پسندی کے رجحان کو روکا جائے۔ تانیثی تنقید عورت کے جنسی استحصال پر احتجاج کرتی ہے۔

تانیثی تنقید مروج مرد اساس معاشرے پر بھی اعتراض کرتی ہے۔ کیونکہ اس مرد اساس معاشرے میں ہمیشہ سے مرد کو مرکزیت اور بالادستی حاصل رہی ہے اور عورت کو ہمیشہ کمزور اور مجبور سمجھا گیا۔ بعض تانیثی ناقدین کا خیال ہے کہ عورتوں کا سماج کے پدری نظام کی وجہ سے سماجی، سیاسی اور معاشی استحصال ہوتا آرہا ہے۔ جس کی عکاسی ادب میں کی جاتی ہے۔

تانیثی فکر وفلسفے اور تانیثی تنقید دونوں کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ تانیثی فکر سماجی وتہذیبی سطح پر جنسی تفریق کے خلاف ہے۔ عورت اور مرد کے لیے مساوی حقوق کی مانگ کرتی ہے۔ اسے تحریک نسواں کا بھی نام دیا گیا۔ بلکہ تانیثی تحریک کی بنیاد ہی اسی فلسفے پر قائم ہے۔ ڈاکٹر آمنہ تحسین اپنے مضمون ''تانیثی تنقید: نظریات ومباحث'' میں لکھتی ہیں:

> ''یہ رجحان مختلف سطحوں پر فروغ پا کر بہت جلد ایک تحریک بھی بن گیا۔ جسے بیسویں صدی میں ''تانیثیت کی تحریک'' کا نام دیا گیا۔ اس تحریک کے نتیجے میں عورت کے وجود تشخص کے متعلق سوال اٹھائے گئے، سوالات اور نو تشکیل شدہ تصورات ونظریات ادبی تحریروں میں بھی ڈھلتے رہے۔ تانیثی فکر جہاں ادب کا حصہ بننے لگی وہیں ادب کی جانچ وپرکھ کے لیے بھی ایک خاص نقطۂ نظر وضع ہوا جسے 'تانیثی تنقید' کا نام دیا گیا۔''

Gynocriticism تانیثی تنقید (Feminism Criticism) سے ہی ملتا جلتا ایک طریق نقد ہے۔ یہ ایک جدید اصطلاح ہے جسے تانیثیت پسند امریکی نقاد Elaine Showalter نے وضع کی ہے۔ جسے اس نے سب سے پہلے 1979 میں اپنے مضمون Toward a Feminist poets میں استعمال کیا تھا۔ Gynocriticism کو اردو میں نسوانی تنقید یا تنقید نسواں کہہ سکتے ہیں۔ شوالٹر کے مطابق ایسی تنقید جس کا تناظر نسوانی ہو اور جو نسوانی فریم ورک میں رہ کر تانیثی ادب کا مطالعہ کرے۔ اس میں عورت کی حیثیت کو مرکزیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ تنقید تانیثی نقطۂ نظر کے تحت کام کرتی ہے اور عورت کا بہ حیثیت ادبی فن کار مطالعہ کرتی ہے۔ نسوانی تنقید میں تنقیدی عمل کے دوران ادب کے حوالے سے عورت کی تخلیقی صلاحیتوں کی دریافت کی جاتی ہے۔ نسوانی تنقید، نسائی حقیقت کو بھی سمجھنے کا ایک ذریعہ ہے۔

نسوانی تنقید اور تانیثی تنقید میں سب سے نمایاں فرق یہ ہے کہ نسوانی تنقید خواتین ادیباؤں کی ہی تخلیقات کو اپنے مطالعے کا موضوع بناتی ہے۔ جب کہ تانیثی تنقید عورت ومرد دونوں ادیبوں کی تخلیقات کو تانیثی تناظر میں مطالعہ وتجزیہ کرتی ہے۔ شوالٹر کا کہنا ہے کہ تانیثی تنقید میں عورتوں کے بارے میں مردوں کے اپنے تصورات ومفروضات ہوتے ہیں اور پورے مطالعے میں ان کا نقطۂ نظر حاوی رہتا ہے جب کہ نسوانی تنقید میں عورتوں کے نظریے سے نسائی رویوں سے بحث کی جاتی ہے۔ نسائی تشخص پر اصرار کیا جاتا ہے۔ نسوانی تنقید سے عورت کی دریافت کے ایک نئے مرحلے کا آغاز ہوتا ہے۔ جب کہ تانیثی تنقید میں مردوں کے نقطۂ نظر اور مردانہ طرز فکر واضح ہوتی ہے۔

اردو ادب میں نسوانی تنقید (Gynocriticism) تانیثی تنقید (Feminist Criticism) ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں ہے۔ اس کے خدوخال ابھی پورے طور پر واضح نہیں ہوئے ہیں اور نہ ہی ابھی اس کے اصول وضوابط مرتب ہوئے ہیں پھر بھی اردو ادب میں تانیثی تنقید کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

☆☆

جنتی جہاں

زہر عشق اور لکھنوی تہذیب

اٹھارویں صدی کا آخری حصّہ اور انیسویں صدی کا ابتدائی دور لکھنؤی تہذیب ومعاشرت کا ایک عبوری دور تھا۔نئی زندگی، نئی قدروں اور نئے اسالیب کو وہ توانائی میسر نہیں ہوئی تھی جن کے مستقل وجود کا احساس ہونے لگتا۔اس زمانے میں لکھنؤی ادب بھی عبوری منزلوں کو طے کر رہا تھا۔ادبی رجحانات میں تغیرات پیدا ہو چکے تھے مگر کسی مستحکم اور انفرادیت سے بھر پور روایت کا آغاز اب تک نہ ہو سکا تھا۔ابھی تک حقیقتاً وہ فنکار نمودار نہ ہوئے تھے جنہیں کلیتاً لکھنوی کہا جا سکے۔

19ویں صدی کے نصف اوّل میں جب معاشرتی حالات اس کے موافق ہوئے تو اردو میں خاص طور سے لکھنؤ میں بھی یہ خارجیت پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہوگئی،فن کا جاہ وجلال دکھانے کے لئے طویل شعری اصناف اور نثر پاروں کی طرف میلان ہوا۔غزل پر مثنوی کے سراپا اور قصیدوں کی خارجیت،طول کلامی،لفاظی وصنعت گری غالب ہوئی۔ داستان ومثنوی،قصیدہ ومرثیہ وواسوخت پر جگہ جگہ لفاظی وطول کلامی جلوہ گر ہوئی۔یعنی شعرو ادب اور زندگی کی سطح پر تہذیبی تصنع پیدا ہو گیا تھا۔

مغل حکومت کے عہد میں تہذیب نے جس قدر ترقی کی تھی،مغل حکومت کی تباہی کے ساتھ ہی وہ ساری تہذیب ودولت لکھنؤ منتقل ہوگئی اور یہاں ایک نئی معاشرت کا نقش بننا شروع ہوا۔

بیسویں صدی کے آغاز سے پہلے اردو مثنوی میں اگرچہ بالعموم لکھنؤ میں سحرالبیان تا زہر عشق اور واجد علی شاہ کے زمانے تک شعروادب اور تہذیب وتمدّن کی دنیا میں نئے انقلاب آرہے تھے اس سے لکھنؤ بے خبر نہ تھا۔اودھ پنچ اور دلگداز کے وسیلہ سے لکھنؤ میں نئے خیالات کی لہریں پہنچ رہی تھیں۔مغربی ادب کے تراجم ہو رہے تھے اور اصلاح ونشاۃ ثانیہ کی فکر بھی کچھ بزرگوں کو لاحق ہوگئی تھی۔محمد حسین آزاد اور حالی نے جدید نظم کی تحریک کا آغاز کیا تو مثنوی کی ہیئت پر خاص طور سے ان کی نگاہ پڑی جو ہر طرح کے خیالات کے اظہار کے لئے موزوں ترین صنف تھی۔

بکسر کی شکست سے پہلے اودھ کے نواب ان آلائشوں سے پاک تھے۔لیکن شجاع الدولہ کے بعد جب بزم آرائی اور عیش پرستی کا دور آیا تو بات یہاں تک پہونچ گئی کہ اودھ کے رئیس اور زمین دار کے یہاں طوائف کے بغیر کسی تقریب کا تصور ممکن نہیں رہا۔وہ معاشرے کے ایک اہم ادارہ کی حیثیت اختیار کر گئیں اور بہت سی تقریبات کا دارومدار انہیں پر ہو گیا۔ان کی محفلوں میں جانا برا نہیں رہا بلکہ تہذیب وشائستگی کی ایک علامت بن گیا۔لوگ تہذیب کا سبق سیکھنے کے لئے ان کی محفلوں میں جانا باعث فخر سمجھنے لگے۔زبان کی لوچ،نرمی ونزاکت اور نکھار کی خاطر لوگ انہیں سرآنکھوں پر بیٹھانے لگے ساتھ ہی طوائفوں کے کوٹھوں کو تہذیب کا گہوارہ سمجھا جانے لگا۔طوائفیں دہلی میں بھی تھیں لیکن یہاں کی معاشرت میں ان کو یہ حیثیت حاصل نہ ہو سکی کہ وہ تہذیب کی نمائندہ ومظہر اور معیار بن سکیں۔شائستگی دہلی میں بھی تھی لیکن اس میں رکھ رکھاؤ،تکلف اور صنّاعی کا وہ انداز نمایاں نہ ہو سکا جو لکھنؤی تہذیب کا نمائندہ تر پہلو ہے۔

لکھنؤ میں شجاع الدولہ کے عہد کے بعد جب جنگ کا تصوّر مبہم ہو گیا۔امراء کی ساری توجہ لباس آرائش اچھے کھانوں اور راچھی طوائفوں تک محدود ہو کر رہ گئی اس کے نتیجے میں نفاست،تصنع اور نسائیت کو لازماً فروغ ہوا،مہندی لگانا،مسّی کی دھڑی جمانا،سروں پر بالوں کی پٹیاں جمانا،ریشمی کپڑے پہننا اور گفتگو سے لے کر اٹھنے بیٹھنے تک میں لوچ و لچک کو محفوظ رکھنا ان کا شعار بن گیا تھا۔

ان کے اثر سے لکھنؤ میں شاعری پر بھی جمالیاتی رنگ غالب ہوا۔رنگین داستانوں نے مثنوی کے حسن کو سنوارا،بیانیہ نظموں نے شاعری کے داخلی جذبات کو محدود دائرہ سے نکال کر ایک رنگین ووسیع ترین فضا میں سانس لینے کا حقدار بنا دیا۔مثنوی ہو یا مرثیہ،قصیدہ ہو یا ریختی، اودھ ہی کے ماحول کی پیداوار ہیں۔

مولانا عبدالحلیم شرر نے صحیح کہا ہے:

> ”زبان اور شاعری کے کمالات کے ساتھ لکھنؤ نے علم وفضل میں ہندوستان کے تمام شہروں سے زیادہ ترقی کی اگر سچ پوچھئے تو علوم کے اعتبار سے لکھنؤ ہندوستان کا بغداد اور قرطبہ اور اقصائے مشرق کا نیشاپور و بخارا تھا“۔

اودھ کی تاریخ میں ایک اہم موڑ اس وقت آیا جب انگریزوں نے اپنی تدبیر جہاں بانی کے تحت اودھ کے حکمراں غازی الدین حیدر کو بادشاہ کا خطاب عطا کیا۔برہان الملک کے زمانے سے لے کر اس وقت تک اودھ کے حکمراں ”نواب وزیر“ کہلاتے تھے اور اپنے آپ کو رسماً وروایتاً سلطنت دہلی کا ماتحت تصور کرتے تھے۔لازمی تھا کہ اس کے بعد نئی بادشاہت ہر لحاظ سے یہ کوشش کرے کہ اس زبردستی کی روایت کے سارے نقوش مٹ جائیں اور یہاں وہ سب کچھ اپنے انداز کا ہو جس سے ایک طرف بادشاہت کے تصور کی تکمیل ہوتی ہو اور دوسری طرف ایک معاشرے کی تشکیل ہو۔

سلطنت اودھ کے زوال کے بعد بھی لکھنؤ میں جس قدر مثنویاں لکھی گئیں اتنی شاید

ریسرچ اسکالر،شعبۂ اُردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ
9837877039 :فون jannatijahan53@gmail.com,

ملک کے کسی دیگر مقام یا خطہ میں نہیں لکھی گئیں اور ان تمام مثنویوں کا وہی روایتی انداز قائم رہا جو میر حسن نے قائم کیا تھا۔لیکن شوق نے اپنا راستہ الگ بنایا،انہوں نے اپنی مثنویوں میں مافوق الفطری عناصر سے پرہیز کرتے ہوئے روز مرہ کے واقعات خواہ وہ عشقیہ ہی کیوں نہ ہوں ان سے فائدہ اٹھایا۔

شوق کی مثنویاں ان کی اپنی سرگزشت ہیں اور ان کی مثنویاں اس زمانے کی لکھنوی معاشرت کی بعض جہتوں کی بہترین ترجمان ہیں۔اس زمانے میں لکھنؤ میں ایک طرف عیش طلبی انتہا کو پہنچ چکی تھی دوسری طرف عزاداری کا عروج تھا۔یہاں مرثیہ خوانی،امام باڑہ،کربلا،درگاہ ،سوزخوانی،تعزیہ داری کا رواج بڑھا ان سب نے تہذیبی اداروں کی سی اہمیت اختیار کرلی۔ان کی مثنویوں میں لباس ہو یا کھانا پینا،آداب محفل ہوں یا طوائفوں کے مجرے،سلام کرنے کا انداز ہو یا شکریہ ادا کرنے کا سلیقہ۔انہوں نے زہر عشق میں اسی ماحول کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔

عطاء اللہ پالوی نے تذکرۂ شوق میں لکھا ہے کہ یہ مثنویاں دراصل شوق کی آپ بیتی ہیں۔وہ خود ان کے ہیرو ہیں ان کے اس اصرار کی وجہ یہ ہے کہ ان کی رائے میں شوق نے یہ مثنویاں لکھنؤ کے بگڑے ہوئے معاشرے کی اصلاح کے لئے لکھی تھیں۔بات پر اثر ہو اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ بطور مثال اپنی ہی سرگزشت پیش کریں۔

واجد علی شاہ کے عہد میں شوق کی دربار میں رسائی ہوئی اور پانچ سو روپیہ ماہانہ ان کی تنخواہ تھی ۔واجد علی شاہ کے عہد میں شاعری کا چرچہ حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔اسی عہد میں ان کی مثنویوں نے شہوت پرستی کی روح پھونک دی اور اسی مذاق کو شاہانہ طبیعت پسند کرتی تھی۔

شوق کی مثنویاں کسی بھی مقصد کے تحت لکھی گئی ہوں ان میں سنجیدہ نگاری اور شوخ بیانی کا جو انداز ہے وہ ایسا آئینہ بن گیا جس میں اس معاشرے کے بہت سے عکس محفوظ ہوگئے،یہ عکس بہت شوخ رنگ ہی سہی لیکن حقیقت کے ترجمان ہیں۔ان کی مثنویوں میں لکھنؤ کلچر کے خدوخال اس طور پر ابھارے گئے کہ اس کے باطن کی تصویر اجاگر ہوگئی اور آسان زبان استعمال کی جو عوام وخواص دونوں کی زبان بن گئی۔

مجنوں گورکھپوری اپنی مرتب کردہ کتاب ''زہر عشق'' میں لکھتے ہیں کہ ایک انگریزی کے پروفیسر جو مجھ سے اردو وفارسی اور عربی میں مدد لیا کرتے تھے،ایک دن انہوں نے مجھے اپنے گھر پر زہر عشق پڑھنے کے لئے بلایا اور دیکھتے ہی کہنے لگے :

''تم لوگ ہو بڑے کمبخت یہ مثنوی اور اس کسمپرسی کی حالت میں۔آج یورپ میں یہ لکھی گئی ہوتی تو شاعر کی قبر سونے سے لیپ دی گئی ہوتی اور اب تک اسی مثنوی کے نہ جانے کتنے رنگ برنگ کے ایڈیشن نکل چکے ہوتے''!

مرزا شوق نے قصیدے بھی کہے اور غزلیں بھی مگر وہ اپنی مثنویوں فریب عشق ،بہار عشق،اور زہر عشق کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔زہر عشق کی ابتدا انہوں نے حمد رب کریم سے کی ہے اس کے بعد اللہ کی مخلوقات کے اوصاف بیان کئے ہیں۔لیکن پھر وہ ہیروئین کے حسن کی تعریف اس انداز سے کرتے ہیں۔

ایک دُختر تھی ان کی ماہ جبیں — شادی اس کی نہیں ہوئی تھی کہیں
ثانی رکھتی نہ تھی وہ صورت میں — غیرتِ حور تھی حقیقت میں
سَبز نخلِ گلِ جوانی تھا — حسنِ یوسف فقط کہانی تھا
اس سنِ وسال پر کمال خلیق — چال ڈھال انتہا کی نستعلیق
چشم بدور وہ حسیں آنکھیں! — رشکِ چشمِ غزالِ چیں آنکھیں
تھا جو ماں باپ کو نظر کا ڈر — آنکھیں بھر کر نہ دیکھتے تھے اُدھر
تھی زمانے میں بے عدیل ونظیر — خوشگلو، خوش جمال، خوش تقریر
تھا نہ اِس شہر میں جواب اس کا — حسن،لاکھوں میں انتخاب اس کا

کسی حسینہ کے شباب اور ملاحت کا یہ مبالغہ انداز بیان اور خارجی مظاہر پر توجہ لکھنوی تہذیب کا خاصہ بن گیا تھا۔یہ لکھنو کا شاعر ہی جوانی کی تعریف میں یہ کہہ سکتا تھا کہ جوانی کیا تھی سبز نخل گل تھی۔

مرزا شوق نے زہر عشق میں ایسے دردانگیز جذبات ہیروئین کی زبان سے کہلوائے ہیں کہ پڑھنے والے کو بھی ہمدردی ہوجاتی ہے۔وہ اپنے محبوب سے بے پناہ محبت کرتی ہے اور آخر میں موت کو گلے لگالیتی ہے لیکن اسے یہ خیال بھی رہتا ہے کہ ہیرو میرے بغیر کیسے رہے گا تو وہ اس کو نصیحت کرتی ہے۔اشعار ملاحظہ ہوں:

دل کو ہم جولیوں میں بہلانا — یا میری قبر پر چلے آنا
جاکے رہنا نہ اس مکان سے دور — ہم جو مرجائیں،تیری جان سے دور!
روح بھٹکے گی ،گر نہ پائے گی — ڈھونڈتی کس طرف کو جائے گی

ہیروئین جس نے عشق میں اپنی رسوائی سے بچنے کی خاطر اپنی جان دے دی اس کو اس بات کا ڈر بھی تھا کہ کہیں مرنے کے بعد اس کا محبوب اس کے غم کو ضبط نہ کرکے اسے رسوا نہ کردے اس لئے وہ مرنے سے پہلے بڑے درد بھرے انداز سے اسے نصیحت کرتی ہے ۔اشعار ملاحظہ ہوں:

تذکرہ کچھ نہ کیجیے گا مرا — نام منہ سے نہ لیجیے گا مرا
اشک آنکھوں سے مت بہایئے گا — ساتھ غیروں کی طرح جایئے گا
آپ کاندھا نہ دیجیے گا مجھے — سب میں رسوانہ کیجیے گا مجھے
رنگ دل کے بدل نہ جائیں کہیں — منہ سے نالے نکل نہ جائیں کہیں

اس مثنوی میں ہیرو کا یہ امتیاز ہے کہ اس کی محبت اندھی نہیں ہے اس نے محبت کے ساتھ ساتھ والدین کے حقوق کو بھی اہمیت دی ہے،وہ اپنی ہیروئین کو اس کی تلقین بھی کرتا ہے ۔یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

شکوہ ماں باپ کا تو ناحق ہے — ان کا اولاد پر بڑا حق ہے
ہوں جو ناراض یہ ،قیامت ہے — ان کے قدموں کے نیچے جنت ہے

ہیرو کے اندر بھی عشق کی وہی شدّت ہے جو ہیروئین کے اندر ہے۔لیکن ہیرو بھی حقیقت پسند ہے۔اس لئے وہ اپنی ہیروئین کو نصیحت کرتا ہے کہ تم مرنے کی بات نہ کرو اور اپنے والدین سے خفا مت ہو کیونکہ والدین کا تم پر بڑا حق ہے کوئی بھی والدین اپنی اولاد کو اتنی آزادی نہیں دیتا،ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ تمہیں کیا لگتا ہے تمہارے مرنے کے بعد میں تمہاری وصیت پورا کرنے کے لئے زندہ رہوں گا۔

دل سے اپنے ذرا یہ رکھنا دور — کون کم بخت یہ کرے گا اُمور
مجھ پہ یہ دن تو کبریا نہ کرے — تم مرو،میں جیوں خدانہ کرے
جان دے دو گی تم جو کھا کر سم — میں بھی مرجاؤں گا خدا کی قسم

اس مثنوی میں مرزا شوق نے لکھنؤ کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔کربلا،درگاہ،نوچندی کے میلے جن پر مذہبی رنگ چڑھا ہوا تھا،عیاشی کے اڈے بن گئے تھے۔وہاں پر وہ سب ہوتا تھا جو طوائفوں کے کوٹھوں پر ہوتا تھا۔

آئی نوچندی اتنے میں ناگاہ — اس بہانے سے آئی وہ درگاہ
بس کے مرتی تھی نام پر میرے — چھپ کے آئی وہاں سے گھر میرے

انہوں نے لکھنوی معاشرے کی زندہ تہذیب کی ترجمانی کی ہے۔زہرعشق پڑھنے سے اس دور کے کلچر وتہذیب ومعاشرت کے خدوخال ہمارے سامنے آتے ہیں۔اس مثنوی کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس دور میں عورتیں کیا پہنتی تھیں اور امیر زادیاں اور بیگمات کسی طرح اکیلی ڈولیوں میں گھومتی پھرتی تھیں۔کس طرح نامحرم کے گھروں پر رات گزارتی تھیں،ان کی زبان ومحاورہ کیا تھا،وہ کن الفاظ اور کس لہجے میں گفتگو کرتیں اور گانے بجانے رقص وموسیقی اور شعروشاعری کی محفلیں کس طرح معاشرتی زندگی کا جزبن گئیں تھیں۔مذہب اور عقیدے کا حقیقی زندگی سے کیا تعلق تھا اور اس کی کیا نوعیت تھی۔ان سب بیانات میں ایک ایسی واقعیت پسندی ہے جس میں آپ بیتی نے معاشرے کے زندہ افراد کو ابھار کر صنف مثنوی کو ایک نیا رخ دیا ہے۔یہاں معاشرہ ایک زندہ روپ میں سامنے آتا ہے اور یہی مقصد تھا شوق کا جو انہوں نے مثنویوں کے ذریعہ پورا کر دکھایا۔

رات بھر میرے گھر میں رہ کے گئی　　صبح کے وقت پھر یہ کہہ کے گئی
بات اِس دَم کی یاد رکھیے گا　　ایک دن یہ مزہ بھی چکھیے گا

اس کہانی کے ہیرو ہیروئین ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔لیکن ان کی محبت کا پتہ ان کے والدین کو چل جاتا ہے اور لڑکی کے والدین خاندان کی عزّت آبرو بچانے کے لئے بنارس بھیجنے کا ارادہ کرتے ہیں تو لڑکی کو اس کا علم ہو جاتا ہے۔اور وہ سارا حال اپنے محبوب کو بتاتی ہے اس کا محبوب اس کو سمجھاتا ہے اور والدین کے حقوق ادا کرنے کی تلقین کرتا ہے۔لیکن لڑکی خودکشی کا حال ظاہر کر کے وہاں سے رخصت ہو جاتی ہے اور زہر کھا کر خودکشی کر لیتی ہے۔لیکن لڑکا بھی اپنی محبت ضبط نہیں کر پاتا اور زہر کھا لیتا ہے۔لیکن خواب میں اس کی محبوبہ اپنی وصیت یاد دلاتی ہے جس کی وجہ سے وہ موت کے منہ سے بچ جاتا ہے۔

وصیت کا شعر:

عین غفلت میں پھر یہ دیکھا خواب　　کہ یہ کہتی ہے وہ چشمِ عِتاب
سن تورے تونے زہر کیوں کھایا　　کچھ وصیّت کا بھی نہ پاس آیا!
ہوئے خود رفتہ ایسے حد سے زیاد　　دوہی دن میں بھلادی میری یاد
دل سے،میرا،بھلادیا کہنا　　ہاں یہی چاہیے تھا، کیا کہنا!
کہہ کے یہ جب وہ ہوگئی روپوش　　کھل گئی آنکھ ،آگیا مجھے ہوش
زہر کا کچھ نہ پھر اثر پایا　　اک تعجب سا مجھ کو یہ آیا
آشنا ،دوست سب کا تھا یہ بیان　　مردے جی اٹھے ،لوخدا کی شان!

ہاں ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ان مثنویوں کا کمزور پہلو جنسی معاملات فحش نگاری اور عریانیت ہے، جو اس وقت کے تہذیبی دھارے کا لازمہ تھا۔لیکن اس دور کو دیکھا جائے تو شوق نے کوئی ایسی غلط بات نہیں لکھی جو ہماری عادات واطوار کے خلاف ہو۔کیونکہ اس دور کو ذہن میں رکھا جائے جو ہم پیچھے بتا چکے ہیں کہ جنسی معاملات وفحش نگاری اور عریانیت عام تھی۔کیونکہ لکھنؤ کے نوابوں میں عیاشی اور آرام طلبی بھی تھی،طوائفوں کے کوٹھوں پر جانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔شوق نے لکھنوی تہذیب ومعاشرت کا حسین مرقعہ اور جیتی جاگتی تصویر اس مثنوی میں پیش کی ہے۔

زبان کی سادگی، جذبات کے بیان کی صفائی کے ساتھ ساتھ اظہار روزمرہ محاوروں کی برجستگی، خاص وعام دونوں کے لئے زبان کا یکساں اور پراثر اسلوب ان کی مثنویوں کی خصوصیت ہے۔مولانا حالی مثنوی کی زبان وبیان کی ان خصوصیات کی بنا پر اسے سحرالبیان پر ترجیح دیتے ہیں اور اپنے مشہور مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''اگر شاعری کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ایک خاص حد تک ان کو بدرمنیر پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔وہ قدیم الفاظ اور محاوروں سے جواب تک متروک ہو گئے ہیں اور حشو دھرتی کے الفاظ سے بالکل پاک ہیں،ان میں ایک قسم کا بیان زبان کی گھلاوٹ ،روزمرہ کی صفائی ،قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی برجستگی کے لحاظ سے بہ مقابلہ بدرمنیر کے بہت بڑھا ہوا ہے،ان میں مردانے اور زنانے محاوروں کو اس طرح برتا ہے کہ نثر میں بھی ایسی بے تکلفی سے آج تک کسی نے نہیں برتا'' [2]

لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شوق نے اس مثنوی میں تہذیبی مادیت یا تہذیب کے حاوی عناصر پر توجہ دیتے ہوئے اپنے ہیرو کے ذریعے اسی تہذیب کے نقائص پر تنقید بھی کی ہے۔اگر ہمیں عبدالحلیم شرر کی کتاب کے علاوہ لکھنؤ کی بولتی تہذیب کو دیکھنا ہو تو زہرعشق کے صفحات پر نظر ڈالنی ہوگی۔

حوالے حواشی

[1] زہرعشق،نواب مرزا شوق،مرتب مجنوں گورکھپوری،اشاعت 13 ستمبر 1930ء ص 13
[2] مقدمہ شعروشاعری،خواجہ الطاف حسین حالی ، ۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ، اشاعت 2013،ص 264

☆☆

ترقیاتی ماہنامہ **یوجنا** نئی دہلی
(ایڈیٹر: ڈاکٹر ابرار رحمانی)
فروری 2019 کا شمارہ **بنیادی ڈھانچہ**
منظرعام پر
مارچ 2019 کا شمارہ
بجٹ
پر خاص ہوگا
مضامین ارسال کرنے کا پتہ:
ایڈیٹر یوجنا (اردو) E-601، سوچنا بھون، سی جی او کمپلیکس نئی دہلی-110003
yojanaurdu.com@gmail.com
قیمت: فی شمارہ 22 روپے، سالانہ 230 روپے
دوسال کے لیے 430 روپے، تین سال کے لیے
610 روپے
قارئین اپنی کاپیاں پیشگی بک کرالیں۔ایجنٹ اور خریدار اپنا آرڈر دیتے وقت **یوجنا** (اردو) ضرور لکھیں
چندہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا بینک ڈرافٹ سے ارسال کر سکتے ہیں
سالانہ چندہ اور خریداری کے لئے مندرجہ ذیل پتہ پر رابطہ قائم کریں:
پتہ: بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، سوچنا بھون، سی جی او کمپلیکس نئی دہلی-110003
فون: **011-24367260**

مہتاب جہاں

بھوپال کی چار باکمال بیگمات

عورتوں نے مردوں کے مقابلے میں برصغیر ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں اپنا ایک الگ مقام درج کرایا ہے۔خواہ وہ اسلامی خواتین حضرت خدیجہ، حضرت عائشہ یا حضرت بی بی فاطمہ ہوں یا سلطنتِ مغلیہ کے عہد میں پیدا ہوئیں ملکہ اور شہزادیاں مثلاً رضیہ سلطان، حمیدہ بانو بیگم، مبارکہ بیگم، ماہیم بیگم، شہزادی گلبدن بیگم (مولفہ ہمایوں نامہ)، نور جہاں بیگم (مغل بیگمات میں سب سے نامور اور حکمرانی میں جہانگیر کے دوش بدوش ہیں)۔شہزادی جہاں آرا مؤلفہ مونس الارواح، ممتاز محل، شہزادی زیب النساء بہترین شاعرہ صاحب تصنیف زیب التفاسیر و زیب المنشآت، شہزادی زینت النساء جو تصوف میں اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے۔ان کے علاوہ مہارانی لکشمی بائی، چاند بی بی اور ہندوستان کی دوسری ریاستوں جیسے اودھ میں ملکہ حضرت محل کی جنگ آزادی میں کارکردگی کو کون بھلا سکتا ہے۔حیدرآباد اور بھوپال کی بیگمات نے وہ نمایاں کام انجام دیئے ہیں جن کو نظر انداز یا فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تمام خواتین اپنی منفرد شخصیت و حیثیت سے جانی و پہچانی جاتی ہیں اور ایسی باکمال عورتوں کو پوری دنیا سلام کرتی ہے۔

بھوپال، وسط ہند کی ایک چھوٹی سی مسلم ریاست تھی۔دوست محمد خان کے ہاتھوں 1725 میں قائم ہوئی۔نواب دوست محمد خان ایک علم دوست، روادار، فیاض اور انصاف پرور انسان تھے۔رعایا کے ساتھ بلاتفریق مذہب وملت معاملہ کرتے تھے۔ان کے خلفاء نے بھی ان کے اوصاف جلیلہ کے ساتھ حکومت کی۔نواب حمید اللہ خان (سلطان جہاں بیگم کے بیٹے) 1926 ریاست بھوپال کے آخری نواب' ان کے زمانے میں یہ ریاست ترقی کی منزلیں طے کرتی ہوئی انڈین یونین میں ضم ہوگئی، اس سے قبل ریاست میں اسلامی قانون جاری تھا دارالقضا اوقاف اور دینی مدارس تھے اور وہ تمام خصوصیات تھیں جو ایک اسلامی ریاست کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں، باوجود یہ کہ ایک چھوٹی سی ریاست تھی مگر اپنی گوناگوں علمی، ادبی اور ثقافتی خصوصیات کی وجہ سے عالمی شہرت کی مالک تھی، یہ ریاست ہمیشہ باکمال اساتذہ، شہرۂ آفاق علما، ماہرین فن، صلحا واتقیا اور مرشدین کاملین کا مرکز و مسکن رہی۔اس کا سینہ علم وعمل کا گنجینہ، اس کی زبان رشد و ہدایت کی ترجمان، اس کی سرزمین صاحبان درس و تدریس کا گہوارہ اور اس کی مسجدیں طالبان علوم نبوت کی پناہ گاہیں تھیں۔ یہ ریاست تعلیم وتعلم، درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا ہمیشہ مرکز رہی، بیشتر علاقوں سے علما و ماہرین فن ترک سکونت کر کے ریاست بھوپال آتے رہے اور سرزمین کو سیراب کرتے رہے۔

بھوپال کی چار روشن خیال، ذی فہم بیگمات، جنہوں نے فلاحی کام، تعلیم وصحت اور مساجد کی تعمیر میں انتہائی اہم کام انجام دیئے اور بھوپال کو ہندوستان کی ایک بہترین ریاست میں تبدیل کر دیا تھا۔تاریخ گواہ ہے کہ ان بیگمات نے ضرورت پڑنے پر مرہٹوں اور راجپوتوں کو کس طرح شکست دی۔1812 میں گوالیار، اندور، اور ناگپور کے مرہٹے اور راجپوتوں نے مل کر تقریباً 82 ہزار سپاہیوں کے ساتھ بھوپال پر حملہ کر دیا اور ان کا پکا ارادہ تھا کہ اس ریاست کا خاتمہ کر دیں گے۔شہریوں نے خود کو قلعہ کے اندر بند کر دیا تھا اور جنگ چھڑ گئی۔نواب بھوپال غوث محمد خان اس وقت شہر سے دور تھے اور جب ان کو اس حملہ کا علم ہوا تو وہ وہیں رک گئے اور پوشیدہ طریقوں سے سامان حرب اور رسد پہنچا سکے، مگر زینت بیگم اور ان کی بیٹی قدسیہ بیگم نے دوسری خواتین کے ساتھ مل کر مردوں کا پُرجوش ساتھ دیا اور بے حد بہادری سے لڑیں۔زخمیوں کی تیمارداری کی، ہتھیار اور کھانا فراہم کرتی رہیں۔زینت بیگم ایک ماہر توپچی تھیں اور آخر کار تین سال تک قلعہ کو محفوظ رکھنے کے بعد انہوں نے مراٹھوں اور راجپوتوں کو مار بھگایا۔اس فتح کے بعد قدسیہ بیگم نے عنان حکومت سنبھالی کیونکہ اس دوران ان کے والد نواب محمد غوث محمد خان کا انتقال ہو چکا تھا۔انہوں نے ایک مضبوط اور مستحکم حکومت کی بنیاد ڈالی۔تقریباً 25 سال حکومت کرنے کے بعد قدسیہ بیگم کا سنہری دور ختم ہوا۔نواب قدسیہ بیگم گوہر بیگم کے لقب سے بھی جانی جاتی تھیں اور بھوپال کی پہلی خاتون نواب ہوئیں۔

1844 میں ان کی بیٹی نواب سکندر بیگم نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور 1888 تک حکومت کی۔ان کے دور میں 1857 کی جنگ آزادی ہوئی مگر انہوں نے بڑی عقلمندی سے بھوپال کو اس بھونچال سے محفوظ رکھا اور باغیوں کو بھوپال میں داخل ہونے نہیں دیا۔آس پاس کے علاقوں سے کافی انگریز خواتین اور بچے بھوپال میں پناہ حاصل کر سکے جس کے لیے انگریز ہمیشہ کے لیے بیگم کے شکر گزار رہے اور ضرورت کے وقت مدد بھی کی۔نواب سکندر بیگم کے اقتدار کا قابل فخر واقعہ 1861 میں رونما ہوا جب وائسرائے لارڈ کیننگ (Lord Canning) نے بیگم کو دہلی آنے کی دعوت دی اور ان کی آمد پر 19 توپوں کی سلامی دی گئی۔دہلی آکر بیگم کو علم ہوا کہ دہلی کی جامع مسجد کو انگریزوں نے اصطبل میں تبدیل کر دیا ہے اور وہاں گھوڑے بندھے ہیں اور غلاظت کے ڈھیر لگے

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔110007
فون:9717412946 mehtabjahan6@gmail.com

ہوئے ہیں تو انہیں بہت دلی رنج ہوا۔ انہوں نے وائسرائے کو اپنی عالمانہ باتوں سے قائل کرلیا اور انگریز کو سمجھایا کے مسلمان ایک بہادر قوم ہے انگریز اُن کی ہمدردی حاصل کر کے فائدے میں رہیں گے۔ وائسرائے نے ان کی بات قبول کی اور مسجد کو خالی کرانے کا حکم دیا۔ بیگم خود جھاڑو اور مشک لے کر جامع مسجد پہنچیں اور مسجد کو دھونا شروع کر دیا۔ بعد میں دوسرے لوگوں نے بھی مدد کی۔ مسجد کی پاکیزگی کے بعد بیگم نے اذان دینے کا حکم دیا اور خود بھی نماز میں شرکت کی۔ بیگم کے اس کارنامے نے اُن کو ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام میں ہر دل عزیز بنا دیا۔ اس کے بعد انہوں نے حج کیا اور بھوپال ریاست میں بہت سی اہم اصلاحات کیں۔

بھوپال کی تیسری نواب شاہجہاں بیگم ہیں یہ نہایت ذہین، قابل، رحمدل اور انصاف پسند حکمراں تھیں۔ ان کے عہد میں بھوپال نے علمی و عمرانی خاصی ترقی کی۔ وضع قانون کا محکمہ قائم ہوا۔ عدالتی اختیارات کی تقسیم ہوئی۔ امن وحفاظت عامہ سے متعلق وسیع انتظامات ہوئے۔ حفظان صحت پر توجہ دی گئی اور انہوں نے تعلیم کی طرف خاص توجہ مبذول کی۔ کئی مدارس کی تعمیر کی جن میں مدرسہ سلیمانیہ اور مدرسہ جہانگیریہ (اپنے والد کے نام پر کھولا) قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ لاوارث اور یتیم بچوں کے لیے مدرسہ بلقیسہ کھولا اور کتابوں کی طباعت کے لیے مطبع شاہجہانی بھی قائم کیا۔ آپ ہی کے زمانے میں فتح الباری (شرح صحیح البخاری)، فتح البیان، تفسیر ابن کثیر وغیرہ اہم کتابیں جو کہ نادر و نایاب تھیں آپ کی سرپرستی میں یہ کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔ بیگم شاہجہاں کے شوہر مولوی صدیق حسن خان جن سے آپ کا عقد ثانی ہوا تھا ایک باکمال عالم فاضل شخص تھے مگر گمنامی کے گوشہ میں پڑے تھے۔ آپ سے شادی ہوئی تو قسمت چمک اٹھی۔ نواب صدیق حسن خان خود بھی کثیر التصانیف تھے۔ ان کی علمی صلاحیتوں کے باعث بھوپال بھی علم وادب کا گہوارہ بن گیا اور بدعتوں کی جگہ پختہ عقیدوں نے لے لی۔

نواب شاہجہاں بیگم کا ایک اور بڑا کارنامہ تعمیرات کے سلسلے میں ہے، وہ مغل بادشاہ شاہجہاں کی صرف ہم نام ہی نہیں بلکہ ذوق تعمیر بھی اُس جیسا ہی تھا۔ ایک چھوٹی سی ریاست کی والیہ ہونے کے باوجود بھوپال کو خوشنما اور خوبصورت عمارتوں سے آراستہ کیا۔ تاج محل، موتی محل، بے نظیر محل تعمیر کرائے اور ان محلات کو عجیب وغریب، دلفریب اور دیدہ زیب چیزوں سے آراستہ کیا۔ تفریح کے لیے پائیں باغ اور اس کے اندر ساون بھادوں اور مختلف قسم کے خوش ثمر درختوں کے باغات لگوائے۔

بھوپال میں تقریباً چار سو مساجد تھیں جن میں کئی تو نہایت بڑی اور خوبصورت تھیں۔ سب سے بڑی مسجد تاج المساجد ہے جس میں تقریباً ایک لاکھ نمازی آسکتے ہیں، یہ سرخ پتھر سے تعمیر شدہ ہے اور ہر سال یہاں ایک عالیشان اجتماع ہوتا ہے۔ جس میں ہندوستان اور بیرون ممالک سے لاکھوں افراد شرکت کرتے ہیں۔ اس مسجد کی بانی بھی بیگم بھوپال شاہجہان بیگم ہیں۔ یہ ان کا ایک زبردست تعمیری کارنامہ ہے انہوں نے اس کی تعمیر 1887 میں شروع کرائی، بیگم صاحبہ کے ذہن میں اس کو واقعی مسجدوں کا تاج بنانے کا خیال تھا اور وہ اس مسجد کو عالم اسلام کی عظیم مسجدوں کے نقشے پر بنانا چاہتی تھیں۔ واقعی یہ مسجد عالم اسلام کی عظیم مساجد میں سے ایک ہے ہندوستان کی سب سے وسیع مسجد ہے۔ دہلی کی جامع مسجد سے مشابہ ہے۔ بلکہ یہ مسجد اس سے ایک تہائی بڑی ہے اور تین منزلہ ہے۔ اس کا رقبہ مشرق ومغرب 526 فٹ ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے انگلستان میں بھی ووکنگ نامی جگہ پر ایک بڑی مسجد تعمیر کرائی۔ ان کا ایک اور بڑا کارنامہ بھوپال کو ہندوستان کے خاص ریلوے نیٹ ورک سے ملانا تھا۔ انہوں نے اپنی ذاتی رقم سے یہ کام کیا اور اس طرح بھوپال کو ایک اہم جنکشن بنا دیا۔ پہلی ٹرین 1884 میں بھوپال میں داخل ہوئی تھی۔ آپ کا دورِ حکومت 1868 اور 1901 تک رہا۔

شاہجہاں بیگم کے بعد ان کی بیٹی سلطان جہاں بیگم بھوپال کی نواب بنیں۔ انہوں نے 1926-1901 تک حکومت کی۔ یہ بھی اپنی ماں کی طرح بہت ذہین اور زمانہ شناس اور اعلیٰ منتظمہ تھیں۔ ان کے دور میں بھی بھوپال نے بہت ترقی کی۔ انہوں نے لڑکے اور لڑکیوں کے لیے لاتعداد اسکول کھلوائے اور مرد اور عورتوں کے لیے جدید اعلیٰ اسپتال قائم کیے۔ پکی سڑکیں، سڑکوں پر ٹھنڈی روشنی والے بلب لگوائے۔ ان کے دور میں کئی اہم صنعتی ادارے بھی قائم ہوئے جس کی وجہ سے شہریوں کو کبھی بیروزگاری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ پورے شہر میں جگہ جگہ پانی کے نل لگے ہوئے تھے اور مسافروں کے لیے سرائے خانے تھے جہاں مفت قیام وطعام کا بندوبست تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس وقت سرسید احمد خاں کی فراخدلانہ مالی مدد کی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تعمیر مکمل کرائی۔ آپ ہی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی پہلی چانسلر ہوئیں/ آپ اپنی خودنوشت سمیت 42 کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ بھوپال میں آپ کے ساتھ ہی خاتون نوابین کا سلسلہ منقطع ہوا اور آپ آخری خاتون نواب ہوئیں۔

سلطان جہاں سے متعلق مختلف مشاہیر نے اپنے نظریے قائم کیے ہیں جن کو بیان کرنا غیر ضروری معلوم نہیں ہوتا۔

علامہ سید سلیمان ندوی اپنے جذباتِ خیر کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> ''علیہ حضرت نہ صرف اسلام بلکہ مشرق کی وہ آخری تاجدار خاتون ہیں جن کے کارناموں پر مرد سلاطین امرا بھی رشک کر سکتے ہیں۔ ان کا دور حکومت جو ربع صدی سے کم نہ رہا بھوپال کی تاریخ کا زریں عہد ہے۔ سلطانہ مرحومہ مشرقی و مغربی تعلیم وتمدن کا ایسا مجمع البحرین (سنگم) تھیں جو آج مصلحین امت کا آئیڈیل ہے۔ وہ نہ صرف فرمانروا تھیں بلکہ ہندوستانی خواتین کی رہنما مسلمانوں کی واحد یونیورسٹی کی چانسلر، مذہبی تعلیم کی سب سے بڑی حامی، علوم وفنون کی سب سے بڑی سرپرست، ہندوستان کی معتدل نسوانی اصلاحات کی سب سے بڑی مبلغ، مسلمان عورتوں میں سے بڑی کثیر التصانیف اور سب سے بڑی مقررہ۔ لیکن ان کے علمی اور اصلاحی کاموں سے بڑھ کر ان کی مذہبی گرویدگی اور ایمانی جوش وولولہ تھا۔'' (یادرفتگان ص112[1])

مسٹر ایم ایف اوڈوائر (گورنر جنرل سینٹرل انڈیا)

> ''میں نے ایک ایسے حکمراں سے ملاقات کی جس کی شہرت تمام سلطنت ہند میں پھیلی ہوئی ہے اور اس خوشنما شہر اور اس کے دلکش نواح کو دیکھا جس کو بور ہانس کی خوش مذاقی اور امور عامہ کی دلچسپی نے اس قدر آراستہ کر دیا ہے۔'' (اختر اقبال ص108[2])

مولانا ابوالکلام آزاد:

الحمد للہ کہ ایک نظیر موجودہ عالم اسلامی میں ایسی موجود ہے جو ریاست و

ملک رانی کے ساتھ شوق علم اور ذوق تصنیف و تالیف کو بھی جمع کرتی ہے اور مزید یہ کہ وہ صنفِ رجال میں سے نہیں ہے جن کو اپنے تقدم کا ہمیشہ غرور بیجا رہا ہے بلکہ اس صنفِ اناث میں سے ہے جس کو دماغی اور ذہنی اشغال سے ہمیشہ معذور سمجھا گیا ہے۔''

(حیات سلطانی۔ص ۳۵[۳])

قرۃ العین حیدر:

نواب سلطان جہاں بیگم ہندوستان کی پہلی خاتون تھیں جو کسی یونیورسٹی کی چانسلر مقرر کی گئیں۔ ہز ہائینس نقاب پہن کر باہر آتی تھیں اور قومی سرگرمیوں میں بہ نفس نفیس حصہ لیتی تھیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یکے بعد دیگرے چار بیگمات بھوپال کی فرمانروا رہی ہیں، انہوں نے خود حکومت کی خود احکام اور فرمان جاری کیے لیکن کسی مولوی نے یہ فتویٰ نہیں دیا کہ عورت کی حکومت جائز نہیں۔ یہ بیگمات پردہ نشین تھیں مگر سلطان بیگم بے نقاب بھی باہر آئیں[۴]۔''

محمد امین زبیری: نذرانۂ عقیدت

کنیز در گہہ رحمان، مکینِ تخت سلطانی — مجسم عبدیت، باشوکت وشان جہاں بانی
ملک خوانی بشکل وصورت زیبائے انسانی — بہ مردانہ مجامد افتخارِ صنف نسوانی
خدیو کشور بھوپال سلطان جہان بیگم

آخر میں اکبر الٰہ آبادی کی نظم کو یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ایسے شاعر ہیں جنہوں نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ پھر سلطان جہان بیگم کے حوالے سے وہ کچھ نہ کہتے تو یہ حیراں کن بات ہوتی۔

اگرچہ والیانِ ملک سے رتبے میں عالی ہیں — مگر یہ والیہ بھوپال کی اللہ والی ہیں
نہایت ہی مفیدِ قوم ہیں فیاضیاں ان کی — بہت راہیں انہوں نے خیر و برکت کی نکالی ہیں
فلک ہے شان ملت کی تو وہ ہیں اختر تاباں — چمن ہے بزم اسلامی تو وہ پھولوں کی ڈالی ہیں
ترقی ان کو ہے مدنظر روشن خیالی کی — انہوں نے اپنی فکریں نور کے سانچے میں ڈھالی ہیں
حریم مشرقی نازاں ہے ان کے علم و دانش پر — یہ روشن ہے کہ وہ اک نور شمع باکمالی ہیں
سوئے تعلیم نسواں منعطف ان کی توجہ ہے — بنائیں جا بجا اس مقصد عظمیٰ کی ڈالی ہیں
مساجد اور مکاتب کی بھی ہیں حامی دل و جاں سے — شیوخ دین وملت نے مرادیں اپنی پالی ہیں
عظیم القدر ہیں فرزند عالیشان بھی ان کے — رہِ حسن عمل میں وہ بھی صرف خوش خیالی ہیں
زمانا گو بہت نازک ہے بے بس ہیں طریق اگلے — مگر دل جن کے اچھے ہیں وہ کب نیکی سے خالی ہیں
دعا ان کو یہی دیتے ہیں ان کے جاننے والے — ولی اللہ ہو ان کا کہ وہ اللہ والی ہیں[۵]

مآخذ:

۱۔ سلطان جہاں بیگم: ڈاکٹر رضیہ حامد، ناشر باب العلم پبلی کیشنز بھوپال، اشاعت اول و دوم 2010-11

۲۔ بھوپال تحریکاتِ آزادی کے آئینہ میں: مطبع کلاسیکل پرنٹرس دہلی، ناشر بھوپال بک ہاؤس بدھوارہ، بھوپال، 1986

۳۔ نواب صدیقی حسن خان: ڈاکٹر رضیہ حامد، مطبع کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس جامع مسجد دہلی 1983

ذیل نویسی ھا:

۱۔ سلطان جہاں بیگم ص294
۲۔ سلطان جہاں بیگم، ص299
۳۔ سلطان جہاں بیگم ص295
۴۔ سلطان جہاں بیگم ص297
۵۔ سلطان جہاں بیگم ص300

☆☆☆

فارم-4

(ضابطہ 8 کے تحت)

'آجکل' کی ملکیت کی تفصیل

1-اشاعت کی جگہ	:	نئی دہلی
2-اشاعت کا وقفہ	:	ماہنامہ
3-طابع کا نام	:	ڈاکٹر سادھنا راؤت
شہریت	:	ہندوستانی
پتہ	:	ڈائریکٹر جنرل، پبلی کیشنز ڈویژن سوچنا بھون سی جی او کامپلیکس، نئی دہلی۔110003
4-ناشر کا نام	:	ڈاکٹر سادھنا راؤت
شہریت	:	ہندوستانی
پتہ	:	ڈائریکٹر جنرل، پبلی کیشنز ڈویژن سوچنا بھون، سی جی او کامپلیکس، نئی دہلی۔110003
5-ایڈیٹر کا نام	:	حسن ضیاء
شہریت	:	ہندوستانی
پتہ	:	پبلی کیشنز ڈویژن، 601A سوچنا بھون سی جی او کمپلیکس، نئی دہلی۔110003
6-ان لوگوں کے نام اور پتے جو پونجی کے ایک فیصد سے زیادہ کے شریک اور حصہ دار ہیں	:	پبلی کیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات ونشریات حکومت ہند، نئی دہلی۔110001

میں ڈاکٹر سادھنا راؤت تصدیق کرتی ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات بالکل درست اور صحیح ہیں۔

(دستخط)

ڈاکٹر سادھنا راؤت

ڈاکٹر حلیمہ فردوس

ظریفانہ ادب میں نسوانی کردار

ظریفانہ ادب کی جڑیں معاشرے میں پیوست ہوتی ہیں۔ یہ ادب زندگی کے بے ہنگم عکس اور سماج کی ناہمواریوں سے عبارت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ظرافت نگار کبھی کبھار مزاحمتی رویہ اپناتا ہے۔ اس مزاحمت میں طنز کی تلخی اور دُکھ کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ کبھی وہ سماج کے رگ وریشے میں منجمد فاسد خون پر نشتر زنی کرتا ہے تو کبھی مزاح کے پھاہوں سے زخم کو بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کامیاب ظرافت نگار کسی کی تضحیک کر کے تالی نہیں پیٹتا، وہ دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھتا ہے تو کبھی گدگدی کر کے زیرِ لب تبسم عنایت کرتا ہے۔ یہی اس کا کمال ہے اور یہی اس کے فن کی معراج ہے۔ اس کی نگاہیں سماج کے ہر کردار کی کمزوریوں پر ٹکی ہوتی ہیں۔ عموماً ظریفانہ ادب کے موضوعات ہی زیرِ بحث رہے ہیں اور نسوانی کرداروں کو قابلِ ذکر ہی نہیں سمجھا گیا۔ آیئے ان کرداروں کی حقیقت جانتے ہیں۔

اس میں دورائے نہیں کہ ظریفانہ ادب کے اولین نقوش یعنی ہجو گوئی اور ہزل گوئی کی صورت میں ملتے ہیں۔ چرکین اور زکّی کا ابتذال اور رکاکت سے مملو ہجویہ کلام کو ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے جبکہ سوداؔ ایک کامیاب ہجو گو کے مرتبے پر فائز ہیں۔ انہوں نے کوتوال اور ضحاک جیسے کرداروں کی خوب ہجو کی مگر شائستگی کے دائرے میں رہ کر۔ البتہ اکبر الہ آبادی کے شعری دربار میں سماج کے کئی کردار ہاتھ باندھے کھڑے نظر آتے ہیں جیسے مولوی، مُلّا، لیڈر، وکیل، استاد، شاگرد، باپ، بیٹا، انگریز حکمراں اور ان کی بیگمات، نوجوان لڑکے لڑکیاں اور مشرقی خواتین وغیرہ۔ گویا قاری ان کرداروں کے ذریعہ بدلتے سماج کے ہر فرد سے متعارف ہوتا ہے۔ طنزیہ شاعری کے امام اکبر الہ آبادی وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے طبقۂ نسواں کو بھی نہیں بخشا۔ انہوں نے جہاں نئی تعلیم اور نئی تہذیب کو نشانہ بنایا وہیں بی بیوں کی بے پردگی اور فرائض سے چشم پوشی کرنے والی خواتین کے علاوہ سبھا کی پریوں کی آزادانہ روش پر کھُل کر طنز کیا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب ایک جانب تعلیمِ نسواں کی ترغیب دی جا رہی تھی تو دوسری جانب تعلیمی شعور کی بیداری سے پیدا ہونے والے نقصانات پر چوٹیں کی جا رہی تھیں۔ علامہ اقبالؔ نے مکالماتِ فلاطوں نہ لکھنے والی ہستی کا اعتراف تو کیا اور یہ بات ''لیکن'' سے آگے نہ بڑھی۔ وہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے، اس طبقہ کے بارے میں فکرمند تھے اور ان کی نگاہیں پردہ اُٹھنے کی منتظر تھیں۔ علامہ اقبال کے بعد ترقی پسند شاعروں نے خواتین کے آنچل کو پرچم بنانے اور زمرد کا گلوبند نکال پھینکنے پر اُکسایا تو بھلا وہ کیسے پیچھے رہتیں۔ مشرقی خواتین میں جہاں اس بیداری سے فائدہ ہوا وہیں معاشرے کو اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔ ایسے میں ملک کی آزادی کے بعد خواتین کا بدلتا کردار اور ان کے مشاغل ظریفانہ شاعری کا موضوع بن گئے۔ تحریف نگاروں نے نہ صرف ترقی پسند نظریۂ ادب کا مذاق اڑایا بلکہ ان کے زورِ قلم سے ایک اہم نسوانی کردار بیوی کے روپ میں ظریفانہ شاعری کے افق پر جلوہ گر ہوا۔ حکومت اور عورت ظریفانہ شاعری کے محبوب موضوعات قرار پائے۔ محمد جعفری کے ''الیکشن کا ساقی نامہ'' دلاور فگار کی ''کے ڈی اے سے شکوہ'' شیخ نذیر کی ''نیا نوالہ'' کے علاوہ علامہ اقبال کی نظم ''حقیقتِ حسن'' کی پیروڈی ''عقدِ ثانی'' میں میاں اور بیوی کے مکالمات سے مزاح کی ایک شگفتہ روایت قائم ہوئی۔ شیخ نذیر کی نظم کے ابتدائی چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

میاں سے بیوی نے اک روز یہ سوال کیا — مرے سوا بھی کسی کا کبھی خیال کیا
ملا جواب کہ اک قحبہ خانہ ہے دنیا — فریبِ قلب و نظر کا فسانہ ہے دنیا

یوں میاں بیوی کی یہ نوک جھونک ایک خطرناک موڑ پر پہنچتی ہے اور نظم کا اختتامیہ منظر قاری کو چونکاتا ہے۔

سُنی میاں سے سنائی گئی پڑوسن کو — غرض وہ بات بتادی کسی نے سوکن کو
پھُلائے سوت نے غصّے میں گال شلغم سے — پٹخ کے توڑ دی ہانڈی زمین پر دھم سے
گلی سے شام کو روتا ہوا کُہا رگیا — میاں جو سامنے آیا تھا کھا کے مار گیا

اس نظم میں قاری بیک وقت تین نسوانی کردار، بیوی، سوتن اور پڑوسن کی حرکتوں کا گواہ بنتا ہے۔ بہرکیف ظریفانہ شاعری کی دنیا میں سانس لینے والی خواتین کی جھُرمٹ میں شکّی، بے رحم اور نک چڑھی بیوی، تیز طرار سوتن، کھِلے کھِلے چہرے والی پڑوسن، اِتراتی سالیاں، ظالم ساس، سجی سنوری شاعرات، پری پیکر ایر ہوسٹس، سے ملاقات ہوتی ہے۔ راجہ مہدی علی خاں کی منظومات میں خصوصاً ''ہنس پڑی، روپڑی'' اور ''قہر البیان'' میں ظرافت کی پھلجھڑیوں کا نظارہ دیکھنے لائق ہے۔ یہ پیروڈی ایک بے مروت بیوی اور مجبور شوہر کی رُوداد ہے۔ اس نظم کا ایک ایک لفظ شاعر کی ظریفانہ حِس کا ترجمان ہے۔

عشرتِ بیوی ہے شوہر کا فنا ہوجانا — نہ کہ ہر بات میں شوہر سے خفا ہوجانا
یک بیک رحم و مروت کا ہَوا ہوجانا — باور آیا ہمیں بیوی کا خدا ہوجانا
پر خدا کو بھی نہیں بندوں پہ اتنا کنٹرول — کھٹکھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

414-A1، گنگا بلاک، نیشنل گیمز، کورمنگلا گاؤں، بنگلور۔ 560047
فون: 09448787013 haleemafirdous@gmail.com

ہماری شاعری کی محبوب صنف غزل میں آج بھی محبوب کے لیے تصغیری صیغہ مستعمل ہے۔تہذیبی روایات کواس کا جواز قرار دیا جاتا ہے لیکن ظریفانہ شاعری میں شاعر بلا جھجک بیوی کا ذکر کرتا ہے۔نظم ،غزل ہو کہ قطعات یعنی ظریفانہ شاعری کی مختلف اصناف میں بیوی کا سکّہ چلتا ہے۔عموماً غزل میں محبوب کے تئیں شعراء کا رویہ تراشیدم و پرستیدم کا ہوتا ہے مگر ظریفانہ شاعر اس پر ایمان نہیں رکھتا وہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے۔ظریفانہ شاعری میں مبالغہ آمیزی ایک اہم حربہ ہے۔شعراء نے اس کا خوب فائدہ اٹھایا ہے۔مثالیں پیش ہیں۔

گردشِ دوراں کیا اندھیر ہے شیرنی ہے مرد،عورت شیر ہے

(دلاور فگار)

اپنے دل کی بنایا جسے مالکن اب وہ شیر و ببر ہو تو میں کیا کروں

(ظفر کمالی)

غزل کا محبوب اپنی ہلالی ابروؤں اور تیغ جیسی مژگاں سے عاشق کو نیم بسمل کیے دیتا ہے مگر ظریفانہ شاعری میں بیوی کا سراپا تو بد ہئیت ہوتا ہی ہے اور وہ ہر وقت بیلن اور جوتے سے لیس نظر آتی ہے۔

نہ بیلن ہی برستا ہے، نہ اب چمٹا کھڑکتا ہے
رسوئی میں اداسی چھا گئی کیا تم نہ آؤ گے

(ٹی این راز)

لیے بیلن کھڑی ہیں بیویاں دونوں مرے سر پر
نہیں بچنے کی صورت درمیانی دیکھتے جاؤ

(مسرور شاہجہاں پوری)

کیا ناپ ہے بیگم کا جو پوچھے کوئی موچی
جو پیٹھ پہ نقشہ ہے بتا کیوں نہیں دیتے

(ظفر کمالی)

مذکورہ بالا اشعار سے بیوی کے ظالمانہ تیور اور شوہر کی مظلومیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ظریفانہ شاعری میں ان دو کرداروں کی مضحکہ خیز تصویروں پر مبالغہ کی رنگ آمیزی خوب کی جاتی ہے۔غزل ہی کیا قطعہ کے چار مصرعوں میں بیوی کے کردار کی جلوہ گری پر قاری بھونچکا سا رہ جاتا ہے۔بیوی سے متعلق اشعار میں ساغر خیامی کی مزاح پاشی کمال کی ہے۔ انہوں نے اشعار میں بیگم کی نفسیاتی کمزوری کچھ اس طرح بیان کی ہے۔

بیگم یہ بولی مجھ سے مرنے کے بعد بھی آنکھوں میں سُرمہ ہونٹوں پہ لالی لگانا ہے
میں نے کہا کے بعدِ قضا اور یہ اہتمام بولیں کہ روزِ محشر اُسے منہ دکھانا ہے

شاعروں نے مختلف شعری اصناف میں نسوانی کرداروں کی فطری کمزوریوں کو نشانہ بنایا ہے۔ضمیر جعفری کی نظم 'عورتوں کی اسمبلی' میں خواتین کی گرم گفتاری اور بسیار گوئی کا اچھا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

مباحث میں یوں گرم گفتار ہیں سب کہ بس لڑنے مرنے پہ تیار ہیں سب
نہ اندازِ غیض و غضب بولتی ہیں بہ آوازِ شور و شغب بولتی ہیں
نہیں بولتی ہیں تو کب بولتی ہیں یہ جب بولتی ہیں تو سب بولتی ہیں

عموماً ظریفانہ شاعری کی تان ظالم اور چرب زبان بیوی پر ٹوٹتی ہے۔اس ہستی کے علاوہ ظریفانہ شاعری کے پردے پر ایک اور کرخت چہرے والی کج فہم شخصیت کی تصویر ابھرتی ہے جسے عرف عام میں ساس کہتے ہیں۔جس کا نام لیتے ہوئے غریب داماد کی سانسیں اُکھڑنے لگتی ہیں۔شعراء نے اس کے خدوخال اور اس کی سازشی فطرت کے ذکر سے اپنے دل کا غبار نکالا ہے۔

ساس کو دیکھا تو ہر جی دار پنکچر ہوگیا
گن کے آگے سینۂ تلوار پنکچر ہوگیا

(نوید ظفر کیانی)

اُن کی ممّی کو سمجھانا میرے بس کی بات نہیں
بھینس کے آگے بین بجانا میرے بس کی بات نہیں

(مسرور شاہجہاں پوری)

پھرتی ہیں ساس خوار کوئی پوچھتا نہیں
کہتے تھے مت پڑو زن و شوہر کے بیچ میں

(شوکت جمال)

آخری شعر میں شوکت جمال نے سماج کی ایک کڑوی سچائی کو مزاحیہ رنگ میں بیان کیا ہے۔ضیاء الحق قاسمی پاکستان کے معروف مزاحیہ شاعر ہیں۔ان کا مجموعہ کلام ''چھیڑ خانیاں'' اردو ادب کی تاریخ میں منظوم خاکوں کی اولین کتاب ہے۔اس میں پاکستان کی ادبی، سماجی اور فلمی ہستیوں کے خاکے شامل ہیں۔انہوں نے آدھا درجن خواتین کے بھی خاکے لکھے ہیں۔پاکستانی ٹی وی کی مقبول فنکار عشرت ہاشمی کا حلیہ کچھ اس طرح قلمبند کیا ہے کہ شیر نما ساس بھی بہو کے آگے بھیگی بلّی نظر آتی ہے۔

وہ ٹی وی کے ڈراموں میں تو عزرائیل ہوتی ہے
جو ہو سسرال میں اپنے تو سسرائیل ہوتی ہے
وہ ٹی وی اور فلموں میں تو ظالم ساس ہوتی ہے
بہو کے سامنے اپنی ٹماٹو ساس ہوتی ہے

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ظرافت نگاروں کی نظریں اپنی بیوی اور ساس کے علاوہ پڑوسن پر ٹکی ہوتی ہیں گویا یہ نسوانی کردار بھی مزاح پیدا کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔احمد علوی نے ایک قطعہ میں پڑوسن اور گھر والی کے موازنے سے مرد کی فطرت کی پول کھولی ہے۔

اب تو گھر والی تری باسی پراٹھا ہوگئی اپنی گھر والی سے تھوڑی بے وفائی کر کے دیکھ
سامنے والی پڑوسن، پھلجڑی ہے پھلجڑی سامنے والی پڑوسن کو ٹرائی کر کے دیکھ

پڑوسن ہی کیا ہوش ربا اداؤں والی شاعرات بھی مزاحیہ شاعروں کا پسندیدہ کردار ہیں۔ظہیر قدسی کی نظم ''اگر میں شاعرہ ہوتا'' دورِ حاضر کی شاعرات کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اس نظم میں مزاح کی بہ نسبت طنز کی تیز کاٹ ہے۔ایک بند ملاحظہ ہو۔

قصیدہ ارد وئے مرحوم کا روتے ہوئے گا کر
غزل ہندی میں اور مہدی حسن کی دھُن میں لکھوا کر
بِنا طبلے، سُرنگی کے غزل جس دھُن میں گا دیتا
ہر اک پیر و جواں، حیرت سے اپنا منہ دبا دیتا
بُرا ہوتا ، بھلا ہوتا اگر میں شا عرہ ہوتا

آج خواتین زندگی کے ہر شعبہ ہائے حیات میں قدم رکھ چکی ہیں۔حتیٰ کہ

بعض پیشے اُن کے لیے مختص ہیں۔ اب وہ گونگی گڑیا نہیں رہیں فضائی میزبان یعنی ایرہوسٹس کی حاضر جوابی دیکھئے:

فضائی میزباں سے یہ کہا جب اک مسافر نے
سنیں سسٹر اگر زحمت نہ ہو پانی پلا دیجئے
جواب آیا ابھی میں آپ کو پانی پلاتی ہوں
مگر سسٹر ہوں کس رشتے سے میں پہلے بتا دیجئے

(شوکت جمال)

ظریفانہ شاعری کے جائزے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ شاعروں نے نہ صرف نسوانی کرداروں کے سراپے سے اپنا جہاں آباد کیا ہے بلکہ ان کی فطری خواہشوں کو بھی نشانہ بنایا ہے۔ طالب خوندمیری کی نظم ''پسند اپنی اپنی'' مادہ پرست، عیش پسند، گھرانوں پر راج کرنے اور آئیڈیل ساتھی کی خواہشمند نوعمر لڑکیوں کا خواب نامہ ہے۔ ان کی ایک اور نظم ''دُکھڑا اپنا اپنا'' نِکمّے شوہروں پر حکم چلانے والی بیگمات اور زن مرید شوہروں کا مرثیہ ہے۔ طالبؔ کی نظموں میں ہمارے سماج کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ انہیں تحریف نگاری میں کمال حاصل ہے۔ وہ غالبؔ کے طرفدار ہیں۔ انہوں نے غالب کو آرکیٹکٹ آئی اے ایس، پامسٹ اور طبیب کے روپ میں پیش کیا ہے۔ نظم ''غالب حسینوں کی جھرمٹ میں'' نہ صرف تحریف نگاری کی کامیاب مثال ہے۔ بلکہ کالج کی شوخ حسیناؤں کا خوبصورت تعارف ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔

اِک شوخ نے کہا کہ سنبھل جائیو اسد — قابو میں اپنے دل کو ذرا لائیو اسد
ایسا نہ ہو کہ آپ بھی پچھتائیو اسد — مستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
کالج تمام حلقۂ دامِ جمال ہے — آکر یہاں کسی کا بھی بچنا محال ہے

ظریفانہ شاعری میں دکنی مزاحیہ شاعر سلیمان خطیب کی منفرد شناخت قائم ہے۔ ان کے کلام میں نسوانی کرداروں کی مضحکہ خیز تصویریں کم کم ہی نظر آتی ہیں۔ انہوں نے ہمارے معاشرے کے دبے کچلے نسوانی کردار جیسے مجبور بیوی اور ماں بیٹی کے علاوہ جہاں دیدہ خالہ، تیز طرار ساس اور تعلیم یافتہ بہو سے متعارف کرایا ہے۔ یہ کردار ہنستے ہوئے غموں کا پیالہ لبوں سے لگا لیتے ہیں۔ محبوب بی اور دکنی بیوی کے روپ میں ہم ایسی عورت کو دیکھتے ہیں جو موم کی مریم نہیں ہے۔ اس کی چرب زبانی کے آگے مجازی خدا کی بھی ایک نہیں چلتی۔ وہ فطرتاً معصوم ہے مگر سخت جان بھی۔ اس باہمت عورت کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے جو شوہر سے بے جا فرمائش نہیں کرتی مگر ضروریاتِ زندگی کے ہاتھوں مجبور ہے۔

کب کتیوں ماٹھی پڑو مجھے پیتمبر ہونا — منجے ہو کاچ لگے، لاک پِنانا سونا
یہ تو عمر کا رہیا روگ جنم کا رونا — کیا کروں آنگ چھپانے کو تو چندی ہونا

بہرکیف ظریفانہ ادب کی شعری اور نثری تخلیقات، نسوانی کرداروں کے ذکر کے بغیر ادھوری ہیں۔ ظرافت نگاروں نے نسوانی کرداروں کے ذریعہ درونِ خانہ افعال کا ذکر ہی نہیں کیا بلکہ بیرونِ خانہ یعنی اسکول، اسپتال، آفس، ادبی مجالس غرض جہاں کہیں ان کا سایہ نظر آتا ہے ان معاملات زندگی سے متعلق واقعات کے خندہ زن پہلوؤں کو دائرۂ تحریر میں لایا ہے۔ اس کا مقصد لطف اندوزی کے علاوہ زندگی کی تلخی کو کم کرنا ہے۔ ان کرداروں کے حوالے سے وہ اپنی زندہ دلی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ غرض ظریفانہ نثری تحریروں میں بھی بیوی کے کردار کو اہمیت حاصل ہے۔ اودھ پنچ کے عہد کی نثری تحریروں جیسے نواب سید محمد آزاد کا مضمون ''لفظ ہندوستانی بیوی'' اور فلک پیما کا مضمون ''پھوہڑ بیوی کی اکیاون لاکھ علامتیں''، خالص انشاء پردازی کے نمونے ہیں جبکہ شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی کی ناولیں، افسانے اور مضامین گھریلو زندگی کے مضحکہ خیز واقعات کی تفسیریں ہیں۔ طنزیہ و مزاحیہ مضامین میں جہاں خواتین کی کمزوریوں پر نشانہ سادھا گیا ہے وہیں ان کی صلاحیتوں کا اعتراف بھی کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ مزاح نگاروں نے بیوی کے سہارے سماجی مسائل کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے۔ قابل تحسین بات یہ ہے کہ انہوں نے بیوی کی کمزوریوں جیسے شکّی پن، فضول خرچی، ٹسوے بہانا اور مائیکے کی اندھی چاہت کے ذکر سے بات میں بات پیدا کی اور فضا کو مزاح بیز کیا ہے۔ دو چار مثالیں پیش ہیں۔

مجتبیٰ حسین نہایت عمدگی سے بیوی کی فطری کمزوری کو یوں شہ دیتے ہیں۔

''وہ ہمیں ٹوکیو میں دوسرے دن ملی اور ہم نے اسی دن اپنی بیوی کو خط لکھا۔ وہ ہمیں ملی۔

دیکھنے میں کچھ خاص نہیں مگر پھر بھی اچھی ہے اب ہمیں اس کی رفاقت میں شب و روز گزارنے ہیں۔ اسی کی سائے میں رہنا ہے۔

(جاپان چلو، جاپان چلو)

معروف پاکستانی مزاح نگار معین قریشی نے ایک اور نسوانی کمزوری کو نہایت بلیغ اشاروں میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے بیوی کو کور کمانڈر اور آنسوؤں کو ابلاغی ہتھیار کہا ہے۔ بیوی کے آنسوؤں کے آگے ہتھیار ڈالنے والے شوہر کا حال دیکھئے۔

''اس نہر میں ہماری ساری جمع پونجی بہہ گئی۔ نیا ٹی وی دوسرے دن ہی آگیا۔ ہماری تجویز ہے کہ میڈیکل کالجوں میں یورولوجی Urology کی طرح ٹیئر ولوجی Tearology بھی پڑھائی جائے تاکہ عورتوں کے اس فن پر اجارہ داری کا خاتمہ ہو سکے۔

(ٹیئر الوجی)

عابد معز کے مضامین بیوی کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتے۔ ایسا بھی نہیں کہ ان کی تحریروں سے بیوی کے کردار کو حذف کیا جائے تو ان کی تحریریں بے رنگ ہو جائیں گی۔ انہوں نے کبھی جزیات نگاری سے کام لیا تو کبھی موازنے اور کبھی مماثلت سے مزاح کے شگوفے کھلائے ہیں۔ جیسے بیوی اور کار کا موازنہ ملاحظہ ہو۔

''بیوی اور ان کی ہم عمر کار میں ہم نے کئی باتیں مشترک پائیں۔ کار اسٹارٹ ہونے میں وقت لگاتی تو بیگم میک اپ میں وقت گنواتی تھیں۔ کار بگڑ کر کھڑی ہو جاتی تھی تو بیگم روٹھ کر منہ پھُلائے بیٹھی رہتی تھی۔ کار ٹھیک ہونے کے لیے میکانک کے پاس جاتی تو بیوی کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے انہیں مائیکے بھیجنا پڑتا تھا۔'' (پرانی کار نیا مالک)

ظریفانہ نثری تحریروں میں بیوی اپنی اداؤں کے برعکس اپنے کڑے تیور سے پہچانی جاتی ہے۔ ظرافت نگار کبھی گھریلو ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے والی بیوی کی دوراندیشی کے گن گاتا ہوا اسے ہوم منسٹر، وزیر مال اور وزیر خزانہ جیسے القاب سے نوازتا ہے اور کبھی اس کی کھلی اڑاتے ہوئے اسے جفا پیشہ جورو، آہنی جورو یا آہنی گرل کہنے سے گریز نہیں کرتا۔ ذیل کی مثالوں سے نہ صرف بیوی کی تنک مزاجی بلکہ شوہر کی بیچارگی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ فیاض احمد فیضی نے مضمون ''شتر مرغ کی تلاش'' میں مغربی تہذیب کی پروردہ بیویوں کے طرز گفتگو پر یوں چوٹ کی ہے۔

''جو بیویاں عدم تشدد پر یقین رکھتی ہیں وہ نفرت، غصّہ یا پیار کے اظہار کے وقت انگریزی کی وہ گالی بے دریغ استعمال کرتی ہیں جس میں ان کے شوہر کی ولدیت کو شک کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ لیکن چونکہ عام طور پر کمانے والی بیوی یہ گالی افشانی کر رہی ہوتی ہے اس لیے شوہرِ نامدار اسے سن کر بالکل بے مزہ نہیں ہوتے۔''

مزاح نگار صرف مرد کی بے چارگی کا مرثیہ نہیں بیان کرتا بلکہ بیوی کی گفتگو کے سہارے سماجی و سیاسی حقائق پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے، ہماری رگِ حمیت کو جھنجھوڑتا ہے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں میاں بیوی کے مکالمے حُزنیہ مزاح کو صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ فکر تونسوی نے طنزیہ مضامین میں اپنی ذات کے علاوہ اپنی بیوی کو بھی تختۂ مشق بنایا ہے اور مجتبیٰ حسین بیوی کا مذاق اڑاتے ہوئے بڑی ہنرمندی سے قاری کے ہاتھوں آئینہ تھما دیتے ہیں اور قاری طنز کی کاٹ سے تلملا کر رہ جاتا ہے۔

''میری بیوی کا نام بھی ماں باپ نے لکشمی ہی رکھا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ اس کے اس گھر میں آنے پر بھی آمدنی میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا تو میں نے اس کا نام بدل دیا۔ جائز آمدنی والوں کی بیویوں کا ہمیشہ یہی حشر ہوتا ہے۔'' (مجھ سے شادی کروگی: فکر تونسوی)

''ہم نے بیوی سے تنہائی میں کہا کہ وہ خدا کے لیے ہم پر کُتّے کے سامنے برسنا بند کر دیں۔ کیونکہ اس سے کُتّے کے اخلاق پر اثر پڑے گا''

(کُتوانسانوں سے خبردار رہو۔ مجتبیٰ حسین)

غرض ظرافت نگار بیوی کی آڑ میں کبھی رشوت خور معاشرے کا حال بیان کرتا ہے تو کبھی اخلاقی قدروں کے زوال پر دل کے پھپھولے پھوڑتا ہے اور کبھی نظامِ تعلیم کی بدحالی پر کفِ افسوس ملتا رہ جاتا ہے۔ ظریفانہ نثری ادب میں ظرافت نگار فضا کو زعفراں زار بنانے کے لیے بیوی کے علاوہ دیگر نسوانی کرداروں کو بھی نشانہ بناتا ہے۔ حتیٰ کہ فنتاسی کا انداز اپناتے ہوئے کبھی عقدِ ثانی کا ذکر تو کبھی بالی ووڈ اور ہالی ووڈ کی ہیروئن کا ہم سفر بن جاتا ہے۔ وہ اپنی ساس کو بھی اس کٹہرے میں لا کھڑا کرتا ہے۔ رؤف خوشتر نے مضمون ''بیت الشرفاء'' میں نیوکلیائی خاندان کے مسئلے کو ایک مزاح نگار کی نظر سے پیش کیا ہے۔ بیت الضعفاء کے مسائل کو موصوف نے بیت الشرفاء کے عنوان سے بیان کیا ہے۔ جس میں تیز طرار عورتوں کی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے۔ انہوں نے اس اقامت گاہ کی سہولتوں اور مکینوں کا نہایت چابکدستی سے نقشہ کھینچا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''خواتین کے حلقے میں ایک سسکتا ہوا نل ہے۔ جہاں ہر بڑی بی کے ہاتھوں میں ایک ایک گھڑا دیا جائے گا اور وہ آہستہ آہستہ دن بھر پانی بھرتی رہیں گی اور دنیا بھر کا رونا روتے ہوئے مشترک راگ الاپتی رہیں گی۔ جو وہ حوّا کے زمانے سے گا رہی ہیں یعنی میں اچھی جبکہ زمانہ اور بیٹے کا زمانہ خراب۔''

مذکورہ مثالوں سے قطع نظر مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں میں بیوی کے کردار کی شناخت اس کی نرم گفتگو سے ہوتی ہے کیونکہ یوسفی کی ظریفانہ کلاسیکی تحریروں کا خاص وصف شائستگی ہے۔ ان کے ہاں بیوی کے تئیں استہزائی عمل کے برعکس ہمدردانہ عمل پایا جاتا ہے۔ طنز و مزاح کا عنصر ان کی ذات کے توسط سے بیوی کے کردار تک پہنچتا ہے۔ وہ خود تختۂ مشق بن کر اپنی رفیقۂ حیات کی ہر بات کو نظرِ استحسان سے دیکھتے ہیں۔ ایک مثال پیش ہے۔

''ہائے اللہ! یہ ہاتھی کا ہاتھی کُتّا کاہے کو لے آئے۔''

''چوکیداری کے لیے''

''کس کی''

''گھر کی''

''اس گھر کی''

''ہاں! بہت ہی ہوشیار کتا ہے۔ گھر میں کچھ نہ ہو، تب بھی چوکیداری کر سکتا ہے۔''

اس ازدواجی مکالمے سے بعد میں ایک فائدہ ضرور ہوا کہ تنخواہ ملتے ہی ہم نے گھر گرہستی کا ضروری سامان خریدڈالا تا کہ کُتّا اس کی چوکیداری کر سکے''۔

(سیزر، ماتاہری اور مرزا)

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ''شامِ شعرِ یاراں'' جو پاکستان کی مشہور شخصیات کی البم ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے معروف شاعرات کشور ناہید، زہرا نگاہ، افسانہ و ناول نگار بشریٰ رحمٰن، ٹی۔ وی۔ اداکارہ ثریا بجیا، ہر دلعزیز پرفیسر روبینہ شاہین جیسی خواتین کی شخصیت کو پیش کیا ہے۔ یوسفی نے ترقی یافتہ سماج کی ان کامیاب خواتین کے خاکوں میں ظریفانہ رنگ آمیزی کی ہے۔ موصوف پروفیسر روبینہ کی شوقِ ضیافت کے بارے میں فرماتے ہیں۔

''روبینہ ان معدودے چند خواتین میں سے ہیں جو کھانا بڑے شوق اور اہتمام سے پکاتی ہیں اور کھلا کر خوش ہوتی ہیں۔ کوئی ڈھنگ سے داد دے تو دوبارہ سہ بارہ کھلاتی ہیں۔ جو خواتین کھانا پکانے اور چولہا جھونکنے کو بیگار اور سزائے زوجیت سمجھتی ہیں قدرت ان کے ہاتھ سے لذّت اور برکت چھین لیتی ہے''۔

بہر کیف ظرافت نگاروں نے دیگر ملازمت پیشہ خواتین پر بھی نظرِ کرم کی ہے۔ اس کی ایک مثال منظور عثمانی کے مضمون ''پرائیوٹ نرسنگ ہوم کا مارا'' ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے نہ صرف ان تجارت گاہوں کی صورتِ حال پر طنز کیا ہے بلکہ نرس کا سراپا بیان کرتے ہوئے انوکھی تشبیہات اور تحریف نگاری کا جادو جگایا ہے۔

''نرس جس نے ہمیں ہتھکڑی پہنائی تھی بالکل شبِ دیجور کی مانند تھی۔ رشکِ لیلیٰ لیکن امید کی کرن کی طرح۔ دانت بڑے تابدار رکھتی تھی۔ اس نے بڑی ڈھارس بندھائی اور ہمارا یقین پختہ ہو گیا کہ ان تاریکیوں کے پہلو میں کروٹیں لے رہا ہے نجمِ سحر۔ ہم نے محترمہ سے کچھ حالِ دل کہنا چاہا تو معلوم ہوا کہ زبانِ یار ملیالم''۔

ظریفانہ ادب میں خواتین کی نمائندگی آٹے میں نمک کے برابر ہے لیکن ان خواتین نے سماجی، سیاسی، مذہبی اور ادبی ناہمواریوں کو اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھا اور اپنے منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ مرد حضرات کے برعکس خواتین نے اپنی ہم نفسوں کی نفسیات کی کامیاب تصویر کشی کی ہے۔ ان کی تحریروں میں ہر طبقے اور ہر قماش کی خواتین اپنے مشاغل اور اپنے مخصوص مزاج کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ کوئی اپنی دولت و امارت کا ڈھول پیٹنے والی ہے تو کوئی علمیت کی دھونس جمانے والی ہے۔ ان میں قافیہ تنگ کرنے والی چرب زبان اور چالاک ملازمہ بھی ہے اور گھر کا سکون درہم برہم کرنے والی مالکِ مکان بھی۔ ان سب سے بڑھ کر قاضی جی کی طرح شہر کی فکر میں گھُلی جانے والی پڑوسن بھی موجود ہے۔ ان سماجی رشتوں کے علاوہ عائلی رشتہ داروں کی فہرست میں سر پر سوار رہنے والی ساس اور دلچسپ عادتوں کی مالک سمدھن بھی شامل ہے۔ ظرافت نگار خواتین نے ان مختلف کرداروں کے ذریعہ کسی نہ کسی سماجی برائیوں کو بے

نقاب کیا ہے۔مرد حضرات کی طرح مبالغہ آمیزی کے ذریعہ خواتین نے ان کرداروں کے چہروں کو مسخ نہیں کیا۔ظرافت نگار خواتین جیسے سلمیٰ صدیقی،شفیقہ فرحت، زینت ساجدہ، رشید موسوی،حبیب ضیاء،لئیق صلاح،بانو سرتاج،شمیم علیم،نسیم تُراب الحسن،انیس سلطانہ،حلیمہ فردوس،فرزانہ فرح نے جہاں ان کرداروں کے چہرے پر مزاح کا غازہ پوتا وہیں ان پے پوتے چہروں پر طنز کی پچکاریاں بھی چھوڑی ہیں اور کبھی دل کے نہاں خانے میں چھپے کرب کا اظہار بھی کیا ہے۔شفیقہ فرحت کا مضمون ''بمبئی کے بازار میں'' گھر اور آفس کے درمیان سینڈوچ بنی عورتوں کی مجبوری کا بیانیہ ہے۔جس میں تانیثیت کی جھلک بھی ہے۔

''خرید وفروخت کی جو ہما ہمی بازاروں میں ہوتی ہے۔اس کا کچھ حصّہ ٹرین کے ڈبّے کے نصیب میں بھی آ گیا ہے۔سوئی، دھاگے،لِپ اسٹک، پاؤڈر سے لے کر ساڑی، ڈریس، میکسی، شرٹ، پینٹ، سبزی، ترکاری، پھل سب چیزیں بڑے زور وشور سے بیچی جاتی ہیں اور بڑے اطمینان سے خریدی جاتی ہیں تاکہ جب تھکی ہاری عورتیں گھر پہنچیں تو کھانا تیار کرنے میں ذرا وقت نہ لگے اور وہ شوہر کی مار اور بچوں کی پھٹکار ودھتکار سے بچ جائیں۔''

ظرافت نگار خواتین کی تحریروں میں تلخی وترشی تو ہوتی ہی ہے لیکن مزاح کے بگھار سے اس کا ذائقہ بدل جاتا ہے۔حبیب ضیا کا مضمون ''چھورا باہر گیا'' بظاہر سماج کے سلگتے مسئلہ سے متعلق ہے مگر ہواؤں میں اڑنے والی ماؤں کی گفتگو زیرلب تبسم عطا کرتی ہے۔ شمیم علیم کے مضمون ''جو نہ بنیں ہماری سمدھن'' میں موقع پرست اور چالاک عورت سے ملاقات ہوتی ہے۔

''وہ جھٹ سے بول پڑیں نعوذ باللہ! میں اپنے بیٹے کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی۔ بیٹے کے ساتھ میں بھی آپ کے ساتھ رہوں گی۔اب دیکھئے نا، آپ بھی اکیلی اور میں بھی اکیلی۔ امریکہ میں تنہائی یوں بھی آدمی کو مارے ڈالتی ہے۔دن بھر منہ سوکھ جاتا ہے۔کوئی بات کرنے والا نہیں ملتا۔میں اور آپ ہوں گی تو خوب مزہ آئے گا۔''

بانو سرتاج اولاً افسانہ نگار ہیں۔وہ بحیثیتِ ظرافت نگاری ان کا ثانوی مشغلہ ہے۔خواتین کی نفسیات پر اُن کی اچھی دسترس ہے۔ان کے مضامین میں خواتین کرداروں کا ذکر ضمناً نہیں آتا بلکہ خواتین کے مختلف کردار اپنے ہاؤ بھاؤ کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔مرد حضرات کے لیے پڑوسن کی ہر ادا دل و دماغ کی طراوت کا ذریعہ ہے تو بانو سرتاج کے لیے اس کا وجود بلائے جان بنا ہوا ہے۔وہ اپنی پڑوسن کی لطف وعنایت کا ذکر کچھ اس طرح کرتی ہیں۔

''ہماری موجودہ پڑوسن کی عظیم ہستی نے ہمیں محافظ یعنی دربان، یعنی چوکیدار کی فکر سے آزاد کر رکھا ہے۔اول تو ان کے فلک شگاف قہقہے ایک کلومیٹر کے دائرہ کار میں کسی چور اُچکّے کو پھٹکنے نہیں دیتے۔دوسرے ان کی چوکس نظروں سے بچ کر کوئی غلط آدمی ہمارے گھر میں داخل نہیں ہوسکتا۔''

(بُری نظر والے تیرا منہ کالا)

حلیمہ فردوس کے بیشتر مضامین میں نسائی فطرت کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ خصوصاً ''سینگ کٹا نا بڑھاپے میں طوطے کے مشورے پر'' مضمون خوش فہمیوں کی شکار عمر رسیدہ خواتین کی نفسیات کا تمثیلی بیان ہے جبکہ ایک اور مضمون ''پیاز کے آنسو'' سیاسی و سماجی حالات کا آئینہ ہے اور موصوفہ ساس کے رشتے پر چٹکیاں لیتی نظر آتی ہیں۔

''پیاز کی گرانی پر آنسو بہانے کا موسم ختم ہوجائے مگر ساس اپنی بہوؤں کو آزمانے کے لیے پیاز تراش کر آنسو بہانے پر مجبور کرتی ہے۔آخر ساس، ساس ہے۔ پیاز سے آزمانے میں اسے مزہ آتا ہے کیونکہ پیار اس کا شیوہ نہیں ہوتا۔''

فرزانہ فرح کی ظریفانہ مجلس میں مختلف پیشہ ور خواتین ظریفانہ رنگ میں رنگی نظر آتی ہیں۔چمچماتے مالس میں قدم قدم پر مسکراہٹ بکھیرتی سیلز گرلز کا حال ملاحظہ ہو۔

''ہم اپنے خیالوں میں کھوئے ہوئے آگے بڑھے تو خوشبوؤں نے ہمیں خوش آمدید کہا۔دکانوں میں سلیقے سے چنی گئی بلوریں عطر وسینٹ کی شیشیوں نے بہ زبان خاموشی اور شیشہ صفت حسیناؤں نے بہ زبان بلند ہمیں اپنی مسکراہٹ سمیت راغب کرنے کی کوشش کی۔'' (شاپنگ واپنگ)

ظریفانہ نثری ادب میں درجن بھر خواتین ہی سہی اپنی موجودگی درج کرا چکی ہیں لیکن ظریفانہ شاعری کے میدان میں ان کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔بھولے بھٹکے جنہوں نے بھی قسمت آزمائی کی جلد ہی اُن کی سانسیں پھُولنے لگیں۔کسی نے تحریف نگاری میں طبع آزمائی کی تو کسی نے ہلکی پھُلکی نظم لکھ ڈالی۔تلاشِ بیسار کے بعد دو چار مثالیں ہاتھ آئی ہیں۔ ان شعری مثالوں میں ظرف کا دامن ہاتھوں سے چھوٹتا نظر نہیں آتا شاعرات نے ساس، بہو، نند، اور بیوی کے کرداروں میں مبالغہ آمیزی کا سہارا نہیں لیا وہ اپنی فطری خوبیوں اور خامیوں سمیت نظر آتی ہیں۔زبیدہ بیگم نے سونامی مزاج ساس کے کردار کو انشاء کے کلام کی پیروڈی کے طور پر پیش کیا۔ظرافت نگار نسیمہ تراب الحسن نے ساس اور شوہر کو انگلی پر نچانے والی آزاد خیال بہو کا احوال چٹخارے دار دکنی زبان میں بیان کیا ہے۔اور ''یہ کیسی عورتیں''، نظم کی خالق سنجیدہ مزاج شاعرہ اسنیٰ بدر جو کبھی کبھار مزاح کے شگوفے چھوڑتی ہیں۔ان کی نظم ''مڈل کلاس بیوی کا شکایت نامہ'' بیوی کی بیچارگی کا بیان ہے۔

میک اپ کروں گی، جاؤں گی میں بیوٹی پارلر — میں بے دھڑک مرد کی کمائی لٹاؤں گی
سوتی رہوں گی میں تو رضائی کو تان کر — گھر بھر کے کام ساس سے خود بیچ کراؤں گی

(نسیمہ تراب الحسن)

ساسو جی ہے نام ان کا — آؤ تمہیں ان سے ملواؤں
ان کے بول دہکتا لاوا — ہم تو ان کے پاس نہ جاویں

(زبیدہ بیگم)

سنا ہے امّی کا سارا زیور سمیٹ جائیں گے نند و دیور
میں اتنی خدمت جو کر رہی ہوں تو کیا عوض اس کا پا رہی ہوں
نہ جانے کیسے یہ غم چھپا یا جو بھانجی کا نکاح آیا
میں پورے البم میں اپنی شادی کے سوٹ میں مسکرا رہی ہوں

(اسنیٰ بدر)

بہر کیف اس تفصیلی جائزے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ظرافت نگاروں کا جہاں مختلف نسوانی کرداروں سے آباد ہے۔انہوں نے نسوانی کرداروں کے فطرت، ان کے مزاج اور ان کے شوق پر کھُل کر چوٹیں کیں اور انہیں سراہا بھی۔دراصل یہ وہ کردار ہیں جن کے سہارے ظرافت نگاروں نے بدلتے سماج کی کوتاہیوں پر غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے۔

☆☆

رئیس فاطمہ

اردو داستانوں میں زنانہ منفی کردار کی فعالیت

داستان بنیادی طور پر تحریری فن نہیں ہے بلکہ سنانے کا فن ہے۔اس کے لیے قاری کی جگہ سامعین ہوتے ہیں۔داستان کی خاصیت یہ ہے کہ اگر اسے تحریر کر دیا جائے پھر بھی بیان کرنے کا انداز نہیں بدلتا۔اس کی عبارت ایسی ہوتی ہے گویا کوئی کہانی سنا رہا ہو۔اردو کے تقریباً سبھی ناقدین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ داستان سننے سنانے کی چیز ہے۔شمس الرحمن فاروقی نے اپنی کتاب 'ساحری، شاہی، صاحب قرانی میں 'بیانیہ' پر تفصیل سے لکھا ہے ساتھ ہی ناول اور داستان کے بیانیہ کی تفریق بھی کی ہے۔

''بیانیہ کی شعریات میں بعض باتیں یقیناً ایسی ہیں جو تمام بیانیہ میں مشترک ہو سکتی ہیں۔ان کا تعلق بیانیہ کے طرزِ وجود (ontology) سے ہے،اس کی علمیات (epistemology) سے نہیں ..... داستان کی صفت یہ ہے کہ اس میں مستقبل کی باتیں بسا اوقات پہلے ہی منکشف کر دی جاتی ہیں،مختصراً یا مطولاً۔پھر وہ سارے واقعات اپنے وقت پر دوبارہ بیان ہوتے ہیں لہٰذا تجسس (suspense) کی وہ نوعیت باقی نہیں رہتی جو ہمیں عام ناولاتی فکشن میں نظر آتی ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ ایسی صورت میں انسان فاعل (subject) سے زیادہ کارکنندہ (agent) کے روپ میں نظر آتا ہے۔یہ بھی ناول کی عام شعریات کے منافی ہے تیسری بات یہ ہے کہ ایک بار بیان کیے ہوئے واقعات کو بیان کریں تو گویا ایک ہی fabula کے لیے دو subject خلق ہوں گے ایسی صورت میں قصے کا وہ تصور معرضِ خطر میں آجاتا ہے جو ناول میں اہمیت رکھتا ہے۔''

(ساحری شاہی، صاحب قرانی 54)

جس طرح ناول اور داستان کے بیانیہ میں فرق ہے اسی طرح کرداروں میں بھی تفریق نظر آتی ہے۔ناول کے کردار عموماً انسانی فطرت سے مانوس ہوتے ہیں۔ان کے افعال وحرکات وسکنات کا تعلق ہماری روزمرّہ کی زندگی سے ہوتا ہے،ہمیں ان کی تمام کارکردگی اپنے اطراف میں دیکھنے کو مل جاتی ہیں جب کہ داستان میں ہمیں انسانی خصوصیات نظر آتی ہیں لیکن انتہائی منزل پر،داستان کے کرداروں کو اگر دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان میں تمام اوصاف انتہا پر ہوتے ہیں،کردار چاہے عورت کا ہو یا مرد کا جو جس صفت کا مالک ہوگا پیدا ہوتے ہی ان میں نظر آجاتی ہے۔یا پھر اکثر قبل پیدائش ان کے متعلق پیشن گوئی کر دی جاتی ہے۔بچپن سے ہی وہ ان تمام خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں جن کا انھیں آنے والے وقت میں مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ان کی (مثلاً امیر حمزہ) شجاعت کا عالم یہ ہوتا ہے کہ سات برس کے سن میں حشام بن علقمہ خیبری کو مار دیتا ہے،بارہ برس کے سن میں ہندوستان کو فتح کر لیتا ہے،چھتیس برس کے سن تک نوشیرواں کو شکست دیتا ہے۔غرض قریب وبعید کی کوئی بھی مشکل ہو انھیں آسانی سے سر کرتا ہے۔یہ خصوصیت صرف ہیرو ہی میں نہیں بلکہ دیگر کرداروں میں بھی نظر آتی ہے کہ وہ بچپن سے ہی آنے والے وقتوں میں اپنی خوبیوں یا خامیوں کا مظاہرہ کرنے کے لیے آمادہ رہتے ہیں۔مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اسی طرح نسوانیت کے تمام حسن ونزاکتوں کی حدوں کو چھوتی نظر آتی ہیں۔اسی طرح بری عورتوں کے کردار تمام برائیوں سے پر نظر آتے ہیں،یہ اوصاف بھی ان میں ابتدا سے ہوتے ہیں۔

''کردار اور کیا ہے؟ بس واقعے کو متعین کرنے والی شئے۔واقعہ اور کیا ہے،بس کردار کے (خواص) کے لیے مثال۔(بحوالہ ساحری شاہی صاحب قرانی جلد اول 95)

کردار کی روح دراصل وہ اوصاف وحرکات ہیں جن کی بنیاد پر کہانی میں ان کے مقام ومعیار کا تعین کیا جاتا ہے۔کردار فرضی بھی ہو سکتے ہیں اور حقیقی بھی،نیک بھی ہو سکتے ہیں یا پھر برے بھی،واضح اور مثالی بھی ہو سکتے ہیں پیچیدہ اور مبہم بھی،انسانی شکل وصورت میں ہو سکتے ہیں اور غیر انسانی بھی،اس کا تعین کہانی میں اس کی سیرت کرتی ہے۔پروفیسر گیان چند جین داستانوی کرداروں کے متعلق اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کرتے ہیں۔

''کردار نگاری محض ایک اصول ہے۔مثالیت دو فریق ہے،ایک وہ ہیں جو خوبیوں کی پوٹ ہیں،دوسرے وہ جو بدی کا مجسمہ ہیں۔یہ نہیں کہ نیکیوں کے ساتھ انسانی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں۔شاید ان میں کمزوری ہوتی ہی نہیں۔''

(اردو کی نثری داستانیں 72)

پروفیسر گیان چند جین نے داستانوی کردار کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔نیک اور بد،یہ تقسیم کرداروں کے اوصاف کی بنیاد پر کی گئی ہے۔اچھائی اور نیکی کا مجسمہ کہانی کا مثبت کردار اور برائی کا پتلہ منفی کردار۔قدیم قصوں میں خیر وشر کی معرکہ آرائی ہوتی ہے اور عین فطرت کے مطابق خیر کی فتح اور شر کی شکست ہوتی ہے۔یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نیکی وبدی کہانی کے دو اہم عناصر ہیں۔یہ کبھی سامنے آکر لڑتے ہیں اور کبھی اپنی عیاری کے ذریعہ کہانی کو ایک نیا موڑ دیتے ہیں یا پھر مبہم اور مخلوط ہو کر کشمکش پیدا کرتے ہیں جن کا تجزیہ کرنا کبھی کبھی دشوار ہو جاتا ہے۔خیر کی اہمیت کا دارومدار براہِ راست یا بالواسطہ شر ہی پر ہے۔شر کے متعلق عبدالرحمن لکھتے ہیں۔

سی وی 3،سیکٹر 23،راج نگر،غازی آباد۔201002 فون:9616775042

''شر ہر وہ چیز ہے جس سے کوئی کراہت کرے یا اس سے نقصان پہنچے''۔

محمد مفتی شفیع نے علامہ ابنِ قیم کے حوالے سے شر کے معنی بیان کرتے ہوئے اسلام میں تصورِ شر کی وضاحت یوں پیش کی ہے۔

''یہ لفظِ شر دو چیزوں سے مستعمل ہے ایک آلام و آفات جن سے براہِ راست انسان کو رنج و تکلیف پہنچتی ہے۔ دوسری وہ چیزیں جو آلام و آفات کے موجبات اور اسباب ہیں۔ اس دوسری قسم میں کفر و شرک اور تمام معاصی بھی لفظ 'شر' کے مفہوم میں داخل ہیں۔''

خیر اور شر کی مقابلہ آرائی تو اس وقت سے ہے جب سے یہ دنیا خلق ہوئی ہے۔ قدیم ہندو دیومالائی قصے ہوں یا دیگر مذاہب کی کتاب ہائے مقدس، سب میں دیوی دیوتاؤں یا راکشسوں کے قصے یا پھر آدم و ابلیس یا اسی قسم کے واقعات ضرور ملتے ہیں۔ داستان کی بنیاد بھی خیر و شر پر ہے۔ اگر چہ انسانی ہمدردی ہیرو کے ساتھ رہتی ہے لیکن کہانیوں میں منفی کردار ہی جان ڈالتے ہیں۔ ہیرو کو challenge دیتے ہیں، انھیں مشکلات میں ڈالتے ہیں۔ جس سے ہیرو بہت مشقت سے یا سحر و ساحری/ تعویز سلیمانی کی مدد/ کسی غیبی مدد/wise old man کے مشورے سے باہر نکلتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ ہیرو کبھی ہمت نہیں ہارتا، آخری سانس تک جنگ کرتا ہے، پریشانیاں برداشت کرتا ہے صحرا نوردی کرتا ہے یہاں تک کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ویلن بھی آخری سانس تک ہیرو کے کام میں رخنہ پیدا کرتے ہیں یہاں تک کے موت آجائے یا پھر بے بس ہو جائیں۔

ویلن کردار بہت پر جوش ہوتے ہیں ان میں کسی قسم کی تساہلی نظر نہیں آتی، اپنے دشمن سے انتقام یا کسی بھی قسم کی بدفعلی کے لیے ہمہ وقت آمادہ رہتے ہیں لیکن یہ وہی افعال انجام دیتے ہیں جو ان کی ذات کا خاصہ ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی ہوس پرست ہے تو اپنی ہوس کی تسکین کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ یہ تمام خصوصیات صرف مردوں میں نہیں بلکہ عورتوں میں بھی نظر آتی ہے۔ جنسی خواہشات کی تکمیل کے لیے اکثر ہیرو اور ہیروئن بھی ویلن بن جاتے ہیں۔ ایسی مثال باغ و بہار میں بھی موجود ہے کہ ہیروئن اپنے محبوب سے ملنے کے لیے سرنگ بنواتی ہے۔ یہ بھی مردوں کی طرح ہوس پرست ہوتی ہیں بلکہ بعض دفعہ مردوں پر بھی سبقت رکھتی ہیں۔ اپنی خواہشات کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتی ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے والدین کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔

داستانوی ادب کا قدیم اسطوری کہانیوں سے گہرا رشتہ ہے۔ اساطیری عہد کی ابتدا دراصل ''سومیری عہد'' سے ہوتی ہے۔ اس عہد کی کہانیوں میں منفی کرداروں کی نوعیت آج سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یونانی، مصری، یورپی اور ہندوستانی کہانیوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان کا وجود ہر عہد میں کم و بیش یکساں رہا ہے۔ وہی سچ اور جھوٹ کی جنگ، اکثر یہ کھل کر سامنے آتے ہیں جب کہ بعض دفعہ ان کے رزائل غیر نمایاں ہوتے ہیں۔ سومیری عہد کی کہانیوں میں ''چرواہا اور کسان'' میں ایسا ہی ایک کردار ''دوموزی'' کا ہے جو مکمل طور سے منفی تو نہیں البتہ اس کے رویّہ سے اس کے ویلن ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

قدیم کہانیوں میں بعض ایسی کہانیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہے جن میں ویلن ہی ہیرو ہوتا ہے مثلاً 'چاند کی پیدائش کا 'ان لل' ۔ یہ ہیرو بھی ہے اور ویلن بھی۔ یہ کردار اپنی ہوس کی تسکین کے لیے چار مرتبہ ایک ہی جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی طرح ''گلگامش'' بھی ہے جو حسن پرست ہے جس کا خوف ہر طرف پھیلا ہوا ہے لڑکیوں اور خوبصورت عورتوں کو اپنی طاقت کے زور پر چھین لیتا ہے۔ اس قسم کی اور بھی کہانیاں دیکھنے کو مل جاتی ہیں جن میں ویلن کا کردار ہی کہانی کی جان ہوتا ہے اور وہی کہانی کا ہیرو بھی ہوتا ہے۔

دیگر مرد منفی کرداروں میں 'اوسیرس' کا ست (set)، اوڈیسی کا 'پولی فیمس' مہا بھارت کا 'دریودھن'، رام چرت مانس کا 'راون' انطی گونی کا 'قریوں' اوتھیلو کا 'ایاگو' paradise lost کا شیطان، فاؤسٹ کا 'میفسٹوفیلس اور اردو داستانوں میں افراسیاب، نوشیرواں، صنعت، افات، لقا، سالوس، خسیسہ، شمس جادو، اور دیگر عیار ہیں۔ یہ بدی کسی خوف یا خواہش سے مجبور ہو کر نہیں کرتے بلکہ اپنا ذاتی و اخلاقی فرض سمجھتے ہیں اور علی الاعلان کرتے ہیں۔

داستانوں میں مردانہ منفی کرداروں کی مانند زنانہ منفی کردار بھی اہم ہیں۔ ان میں بھی تقریباً وہی اوصاف موجود ہوتے ہیں جن سے مرد حضرات متصف ہیں۔ جس طرح مرد کرداروں کی فعالیت ہے اسی طرح عورتوں کے بھی کہانیوں میں بہترین منفی کردار مل جاتے ہیں۔ قدیم عالمی ادب میں جہاں male negative characters ملتے ہیں، وہیں female negatrive character موجود ہیں۔ کہانیوں کو دلچسپ بنانے میں یہ بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ رزمیہ ایلیڈ کی ''ایفروڈائٹی'' ہومر کا یہ منفی زنانہ کردار اس لیے اہم ہے کیوں کہ troy کی جنگ کی بنیادی وجہ یہی تھی۔ اوڈیسی کے منفی کرداروں میں اگر چہ پولی فیمس سب سے زیادہ اہم کردار ہے لیکن کرنی (circe) جادو گرنی، کلسپو دیوی (calyposo)۔ اس کے علاوہ چھ گردنوں والی سکلا (چڑیل) اور اس کی بہن کا بڈس بھی اہم ہیں۔ اس قسم کی بہت سی عورتیں ملیں گی جن کے کردار کہانیوں کو دلچسپ بنانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ یا کم از کم challenge دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

اردو کی سب سے اہم اور ضخیم داستان ''امیر حمزہ'' میں ویلن عورتیں بہت سی ہیں جن کی خباثت اور رزائل مردوں کو پیچھے چھوڑ دیتی ہیں۔ حصیصہ، نور افشاں، تاریک شکل کش، ملکِ فرعونیہ کی ساحرہ ملکہ دمامہ اور ملکہ یاقوت سخندان ایسے کرداروں کی بہترین مثالیں ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں۔

''داستان میں عورتوں کی حیثیت بہت پیچیدہ اور غیر معمولی ہے۔ سحر و ساحری اور عیاری میں وہ مردوں کے ہم پلہ ہیں۔ بلکہ بعض اوقات مردوں سے بڑھی ہوتی ہیں۔ افراسیاب کی وزیر اول صنعت سحر ساز بہت زبردست ساحرہ ہے۔ دیگر ساحراؤں میں مجلس جیسی نوعمر لڑکی ہے جو مردوں کو بلاشبہ تنگنی کا ناچ نچاتی ہے۔''

شمس الرحمٰن فاروقی نے حجرۂ ہفت بلاؤں میں سے ایک بلا ''تاریک شکل کش'' کو پوری داستان کا خونخوار ترین کردار قرار دیا ہے جو بہت بڑی ساحرہ ہے۔ یہ صورت کے اعتبار سے بھیانک ہے دشمن کو سیدھا پھاڑ کھاتی ہے۔ اس کی آمد کی خبر سے نا صرف لشکرِ اسلام بلکہ افراسیاب کے لشکر میں بھی دہشت پھیل جاتی ہے۔ ڈاکٹر شفیق احمد لکھتے ہیں:

''ویلن کردار کے اعمال ان کی صورت سے زیادہ ڈراونے ہوتے ہیں۔ تاریک شکل کش زندہ انسانوں کو کھاتی ہے اور کھانے کا انداز بھی مکروہ۔ ایک نوجوان کو پکڑ کر گھسیٹا اور کھانے لگی۔ ہڈیاں تک چبا جاتی ہے۔ اس نوجوان کی چیخیں اور کراہیں اسے ذرا بھی متاثر نہیں کرتیں۔ (بحوالۂ شہناز کوثر، اردو داستانوں کے منفی کردار 53)

خود افراسیاب کہتا ہے:

''دائی اماں کا سحر نہیں قہرِ سامری و جمشید ہے... جس کو پکڑیں گی چیر پھاڑ کر کھا جائیں گی۔ حقیقت میں یہ امر ملحوظِ خاطر رہے جو ہاتھ سے تاریک کے مارا گیا وہ اصل مرا۔''

(طلسمِ ہوش ربا جلد ششم 172)

اس کے علاوہ ملاحظہ ہو:

''فوت ہے ہم سب کی جان کو، تاریک شکل کش ملک الموت ہے ساحر نامدار آرام خوار اس کے ہاتھ سے بچنا دشوار ہے حقیقت میں وہ ملعونہ بلائے روزگار ہے''۔ (ایضاً)

تاریک شکل کش کا کردار وحشیانہ ہے اس کی صورت و سیرت حرکات و سکنات تمام کریہہ ہیں اس کے حلیہ کے متعلق لکھا ہے۔

''دیونی سیہ فام بیجا کی خالہ پردۂ ظلمات کی نشانی کلوا کی نانی لہنگا بہت بھاری کالی کالی صورت اس پر چیچک کے داغ صاف ظاہر ہیں بال کھلے ہوئے برگد کی داڑھی کے مثل آنکھیں غار مہیب صورت عجیب و غریب، دونوں ہاتھ ٹیکے ہوئے، زبان منہ سے نکلی ہوئی، باچھوں سے خون ٹپک رہا ہے، دیکھ کر قلب کانپتا ہے۔ خوف ہے طائرِ روح قفس جسم سے نہ نکل جائے.... خال چہرۂ شب قد ملعونہ تاڑ کا درخت دل مثلِ سنگ سخت و کرخت جب ڈکار لے کر سر اٹھایا منہ سے دھواں نکل کر آسمان پر پہنچا گویا ابر دھواں دار چھا گیا، شراب کے مٹکے پیتی ہوئی بجائے گزک ران بھینسے کی ہاتھ میں لیے اس کو چباتی ہوئی باچھوں سے خون ٹپک رہا ہے لختے خون کے سینے پر جمے ہوئے گویا صفحہ سنگ سیاہ پر سرخ جانور بیٹھے ہیں۔''

(طلسم ہوشربا جلد ششم 176)

اس کے علاوہ اس داستان میں ایسی عورتیں بھی ہیں جو ہوس پرستی اور جنسی خواہشات کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتی ہیں، انھیں دریغ نہیں یہاں تک کہ قتل و غارت پر بھی آمادہ ہیں۔

''عشق و عاشقی کے معاملات میں عورتیں اکثر پہل کرتی ہیں اکثر وہ اپنے منظورِ نظر کی خاطر اپنے والدین خاص کر باپ کا قتل کرا دیتی ہیں یا باپ کو خود ہی قتل کر ڈالتی ہیں۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی، ساحری شاہی صاحب قرانی)

تاریک شکل کش کی مانند ملکِ فرعونیہ کی ساحرہ ملکہ دمامہ جادو، یہ سحر و ساحری میں بھی ماہر ہے اور کریہہ الصورت بھی ہے۔ صورت میں تاریک شکل کش کی مانند ہے۔ یہ جب میدان میں آتی ہے تو چار ہاتھیوں پر اس کا ہوج ہوتا ہے جس پر سوار ہو کے سات سو اژدہے کوہ آتش فشاں ہیں سامنے آتے ہیں۔ یہ کیوں کہ علم نجوم سے بھی واقف ہے اس لیے لشکرِ اسلام سے مقابلے پر نہیں آتی۔ کیوں کہ اس نے اپنے علم کے ذریعہ معلوم کر لیا تھا کہ تیس دن اس پر بھاری ہے اور وہ ان ایام کے گزر جانے تک خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی۔

ملکہ یاقوت سخن دان بھی ایک بلا ہے۔ اس کے پاس جادو کی نہریں ہیں اور جب وہ میدان میں آتی ہے تو اس کے جادو کی دو نہریں ایک ساتھ چلتی ہیں اور رزم گاہ میں پھیل کر دشمنوں کو غرق کر دیتی ہیں۔ ان نہروں میں مچھلیاں بھی ہوتی ہیں جو دشمنوں پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ ملکہ یاقوت سخن دان کا اہم طلسم اس کا عفریتِ طلسمی ہے جو دشمنوں کو پھانک جاتا ہے۔ اس پر بڑے بڑے ساحروں کا طلسم بھی اثر انداز نہیں ہوتا، اس کی خاص بات یہ بھی ہے کہ یہ بلا کی حسین ہے اور افراسیاب سے شادی کی خواہشمند بھی ہے۔

امیر حمزہ کے علاوہ اردو کی دیگر داستانوں میں بھی خواتین کے منفی کردار نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ اردو کی منظوم کہانیوں میں بھی خبیث عورتوں کے قصے ہیں لیکن امیر حمزہ کے کرداروں کے مقابلے میں مختلف قسم کے ہیں البتہ ایسے کردار بہت سے دیکھنے کو مل جاتے ہیں جن میں معشوق کو حاصل کرنے کی چاہت انھیں ہر جائز و ناجائز کام کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ محبوب کو قید کرتی ہیں البتہ اس وقت تک انتظار کرتی ہیں جب تک کے رضا مند نہ ہو جائے مگر ہیرو تمام مشقتیں تو برداشت کرتا ہے لیکن کسی طور راضی نہیں ہوتا ہے۔ آخر میں وہ شکست کھا کر ذلیل ہوتی ہیں۔ ان میں حسد اور ہوس بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن اپنے محبوب کو نقصان نہیں پہنچاتیں۔ اس قسم کے واقعات منظوم و منثور کہانیوں میں عام ہیں۔ ایسے کردار امیر حمزہ کے کردار سے مختلف نظر آتے ہیں۔ ان میں عام زندگی کی جھلکیاں عشق کی کامیابی و ناکامی، ان کا غم و غصہ صاف نظر آتا ہے۔

اس کے علاوہ کہانیوں میں کٹنیاں ہوتی ہیں جو راز چرانے کا کام کرتی ہیں۔ یہ بہت ہوشیاری سے دشمن سے راہ و رسم رکھتی ہیں اور ان کی ہمدرد بن کر اپنے مدعا تک پہنچتی ہیں۔ اسی قسم کا ایک کردار ''باغ و بہار'' میں بھی ہے۔ ''یہ بڑھیا شیطان کی خالہ'' بہت ہی عیاری اور مکاری کے ساتھ شہزادی فرنگ کی تلاش میں نکلتی ہے۔

''کٹنی کے پیشہ کی مثالی عیاری اور سماج میں اس کی ایک مسلمہ حیثیت اس کی گفتگو کے پورے انداز اور اس گفتگو کے لفظ لفظ میں چھائی ہوئی ہے''

(ہماری داستانیں 85)

کہانیوں کے اچھے کردار عموماً شہزادی، ملکہ، نیک بخت ہوتے ہیں جب کہ برے کردار کی عورتیں چڑیل، کٹنی، جادوگرنی، بد بخت، شیطان کی خالہ، وغیرہ سے جانی جاتی ہیں۔ لیکن کچھ ایسے بھی کردار ہوتے ہیں جو بظاہر نیک ہوتے ہیں لیکن حرکتیں بری ہوتی ہیں۔ یہ کردار مثالی نہ ہو کر انسانی زندگی سے قریب نظر آتے ہیں۔ بعض دفعہ انھیں اپنی غلطیوں پر پشیمانی بھی ہوتی ہے، اور یہ ہیرو کی مدد پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ کردار اصل میں نفس لوامہ کے زمرے میں آتے ہیں لیکن اصل منفی کردار ان عورتوں کا ہوتا ہے جو علی الاعلان قتل و غارت کرتے ہیں۔ انھیں اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ ہمیں انھیں کاموں کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ غرض برائیاں فخریہ انجام دیتے ہیں۔ ایسے کردار ہی نفس امارہ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اسی قسم کے منفی کردار ہی نفس مطمئنہ رکھنے والے کرداروں کے مدمقابل ہوتے ہیں۔ انہیں کردار کی وجہ سے اچھے کرداروں کے لیے قارئین و سامعین کے دل میں محبت پیدا ہوتی ہے اور منفی کردار ہی ہیرو کو مزید مشکلات میں ڈالتے ہیں جس کے نتیجہ میں ان کی جواں مردی اور ذکاوت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ غرض منفی کردار داستان کے لیے اتنے ہی ناگزیر ہیں جتنا کی ہیرو کا کردار۔ رہی بات خواتین کی تو داستانوں کی دلچسپی کو دوبالا کرنے کے لیے عورتوں کے منفی کردار کو کہانیوں میں جا بجا پیش کیا ہے بلکہ بعض دفعہ تو کہانی کے منفی کردار میں کوئی عورت ہوتی ہے تو بعض دفعہ معاون ہوتی ہے یا پھر کہانی میں معرکہ اور فساد کی بنیادی وجہ بن جاتی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا قطعی غلط نہیں ہوگا کہ عالمی داستانی ادب ہو یا اردو داستانی ادب میں زنانہ منفی کردار ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور ان کرداروں کے بغیر داستانیت مفقود ہو جائے گی اور داستان کی بنیادی خصوصیت یعنی دلچسپی کا عنصر باقی نہیں رہے گا۔

☆☆

عابد حسین

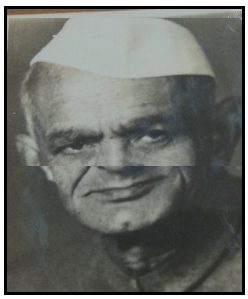

ڈاکٹر عابد حسین کی ایک غیر مطبوعہ تحریر

یہ باب ڈاکٹر عابد حسین (1896-1978) کے ایک غیر مطبوعہ ناول ''آزادی کی زنجیریں'' کے مسودے سے لیا گیا ہے۔ یہ نامکمل مسودہ ان کے پرانے کاغذات میں ان کے بھتیجے اور میرے ماموں رضا مہدی صاحب کو ملا تھا۔ عابد صاحب کے بے حد خوبصورت مگر پنسل سے بہت باریک لکھے ہوئے متن کو ، میں نے بہت محنت اور شوق سے پڑھا اور خود ٹائپ کیا ہے۔ انشاءاللہ جلد ہی یہ ناول شائع کیا جائے گا، اس کا ایک دلچسپ باب پیش خدمت ہے۔

عذرا نقوی

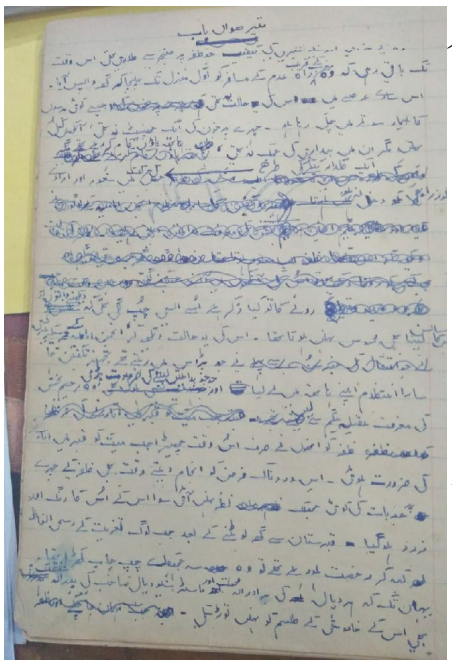

''**نئے** ادب'' کے حلقے کے کئی جلسوں میں ظفر اور ہردیال کا بلاوا آیا تھا مگر وہ نہیں جا سکے تھے۔ اب کی سنیچر کو چھ بجے شام کو پھر اس کا جلسہ جارج ٹاؤن میں راج نرائن صاحب وکیل کے ہاں ہونے والا تھا اور بال کرشن کا سخت اصرار تھا کہ یہ دونوں اس میں ضرور شریک ہوں۔ بال کرشن نے انھیں راج نرائن صاحب کے صاحبزادے اقبال بہادر سے ملوایا جو یونیورسٹی میں بی۔اے میں پڑھتے تھے اور حلقے کے روحِ رواں تھے۔ انھوں نے اور بھی زیادہ اصرار کیا اور ظفر اور ہردیال کو شرکت کا وعدہ کرنا پڑا۔

جمعے کو رات کے کھانے پر ہردیال نے اکرام اللہ سے کہا ''اکرام صاحب آپ نئے ادب کے حلقے سے واقف ہیں؟ کل شام ہم لوگوں کو اُس کے جلسے میں شریک ہونا ہے، میں چاہتا ہوں کہ پہلے سے کچھ معلوم ہو جائے کہ یہ لوگ کیا بیچتے ہیں''

اکرام اللہ: میں شروع میں اس کے کئی جلسوں میں شریک ہوا تھا مگر پھر جانا نہیں ہوا۔ چند قابل مخلص نوجوانوں نے جو سوشلزم اور کمیونزم سے متاثر ہیں یہ حلقہ ادب کی اصلاح کے لئے قائم کیا ہے۔ اور مہینے میں ایک بار جمع ہو کر مضامین اور افسانے پڑھتے ہیں۔ کچھ اور لوگ محض تفریح کے لئے یا نئے ادب کی قدردانی کو فیشن سمجھ کر شریک ہو جاتے ہیں۔

ہردیال: آپ میری جہالت پر ہنسیں گے مگر دیہاتی سمجھ کر معاف کر دیجئے۔ میں نے سوشلزم اور کمیونیزم اور 'نئے ادب' کا نام تو سنا ہے اور لڑکوں پر رعب جمانے کے لئے خود بھی یہ الفاظ اپنی تقریروں میں استعمال کئے ہیں مگر قسم لے لیجئے جو یہ معلوم ہو کہ ان کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ کسی دن کوئی پوچھ بیٹھا تو پول کھل جائے گی۔

اکرام اللہ: تم تو معاشیات اور تاریخ کے طالب علم ہو اور تمھارے پروفیسر تمھیں سوشلزم اور کمیونزم کے اصول علمی حیثیت سے سمجھائیں گے۔ میں تو ایک کھلنڈڑا یار باش آدمی ہوں۔ ہر طرح کے لوگوں سے ملتا رہتا ہوں جن میں سوشلسٹ اور کمیونسٹ بھی ہیں۔ جو کچھ سنی سنائی باتیں کان میں پڑ گئی ہیں تمھیں بتا سکتا ہوں۔ سوشلسٹ تو وہ ہیں جو چاہتے ہیں کہ زمین، کانیں، کارخانے، غرض سب چیزیں جو دولت یا مال کی پیداوار سے تعلق رکھتی ہیں کسی ایک کی ملکیت نہ ہوں بلکہ پوری جماعت کی ہوں اور ان کا انتظام حکومت کے ہاتھ میں ہو، تاکہ وہ انھیں اپنے ذاتی فائدے کے لئے نہ چلائے بلکہ سب کے فائدے کے لئے ہو۔

ہردیال: بھئی واہ! کیا اچھا اصول ہے۔ بہار اپنی، گل اپنے، گلشن اپنا، باغباں اپنا اور کمیونسٹ کیا چاہتے ہیں؟

اکرام اللہ: وہ ان سے دو ہاتھ آگے ہیں۔ ان کا اصول یہ ہے کہ ذاتی ملکیت ہونی ہی نہیں چاہئے۔ صرف دولت کی پیداوار ہی نہیں بلکہ اس کی تقسیم بھی حکومت کے ہاتھ میں ہو اور وہ سب کو ضرورت کے مطابق بانٹ دے۔ ان میں سے ایک فرقہ اتنا کٹر نہیں، وہ کہتا ہے کہ ہر شخص جو کچھ اپنی ذاتی محنت سے کمائے وہ اس کی ملکیت ہو اسے جیسے چاہے خرچ کرے، مگر ایک تو وہ چیزیں جن کی سب کو ضرورت رہتی ہے اسے اپنے حصے سے زیادہ نہ خریدے، دوسرے کسی کو یہ حق نہ ہو کہ سرمایہ جمع کر کے سود پر چلائے یا دوسروں کو نوکر رکھ کر ان سے محنت کرائے اور نفع سب اپنی جیب میں رکھے۔

ہردیال: یہ اس سے بھی چوکھی رہی۔ خود کنواں کھودو اور خود پانی پیو۔ مگر لوگ اتنے کمیونزم کے خلاف کیوں ہیں۔ ملوں کے مالک، زمیندار، بنئے، مہاجن، مخالفت کریں تو ایک بات بھی ہے۔ میں نے اپنے جیسے غریب طالب علموں کو کمیونسٹوں کو برا بھلا کہتے سنا کہ یہ مذہب اور اخلاق کے دشمن ہیں۔

اکرام اللہ: بات یہ ہے کمیونسٹ کارل مارکس کے فلسفے کے قائل ہیں جس کی رو

shamapervez@hotmail.com فون:09958933161

سے مذہب اور اخلاق کی نشہ آور گولیاں سرمایہ داروں نے اس غرض سے تیار کیں کہ مزدور اور کسان انھیں کھا کر مست رہیں اور ان کو یہ احساس نہ ہو کہ سرمایہ دار/ان کی محنت سے خود فائدہ اٹھاتا ہے۔

ہردیال: یہ ذرا ٹیڑھا مسئلہ ہے، یہ میں کیسے مان لوں کہ جن بزرگوں نے مذہب کی تعلیم دی وہ سرمایہ دار تھے یا سرمایہ داروں کے زیر اثر تھے۔ میں نے انکے بارے میں جو کچھ پڑھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔

اکرام اللہ: بھئی یہ تو میں نے بھدّے موٹے لفظوں میں بتایا ہے۔ مارکس کے فلسفے میں بڑی باریکیاں ہیں۔ مجھے کمیونسٹ دوستوں نے اس کی ایک موٹی سی کتاب 'داس کیپٹل' پڑھنے کو دی مگر اس قدر ادق ہے کہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا اور نہ یہ حضرات مجھے سمجھا سکے۔

ظفر: مگر سوشلزم اور کمیونزم کو ادب سے کیا تعلق ہے، اور یہ نیا ادب کیا چیز ہے؟

اکرام اللہ: اصل میں نئے ادب کا، خصوصاً نئی شاعری کا شوق مجھے ان انقلابی نوجوانوں کی صحبت میں کھینچ لے گیا۔ نئے ادب کی دو شاخیں ہیں ایک تو وہ جس میں نیا پن زیادہ نہ ہو کہ شاعری اور انشا پردازی کے ضابطوں کو نظر انداز کر کے من مانے طریقے سے اظہار خیال کیا جائے، نظم میں قافیے اور مقررہ وزن کی اور نثر میں ربط و تسلسل کی زنجیروں کو توڑ دیا جائے۔ ان ادیبوں اور شاعروں کے یہاں عموماً خیالات میں بے ربطی اور انتشار کے سوا کوئی جدّت نہیں ہوتی۔ یہ اصولِ فن کے خلاف بغاوت ہے جس میں کامیاب ہونے کے لئے غیر معمولی دل و دماغ کی ضرورت ہے اور وہ اب تک ان نو مشقوں میں کسی میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ دوسری شاخ وہ ہے جس میں ادب کے قالب کے لئے اتنا زور نہیں دیا جاتا جتنا اس کی روح کے بدلنے پر۔ اسے ترقی پسند ادب کہتے ہیں اور اس کے علم بردار عموماً کمیونسٹ یا سوشلسٹ نوجوان ہیں اُن کا سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ ادب و شعر کا موضوع رومانی اور خیالی دنیا نہ ہو بلکہ واقعی زندگی اور اسکی تلخ و ناگوار حقیقتیں بھی ہوں۔ وہ چاہتے ہیں کہ شاعر اور افسانہ نگار موجودہ نظام زندگی کی قباحتوں، افلاس، بیماری، بدکاری، لالچ، خود غرضی، ظلم کا پردہ کھولے تاکہ لوگوں کے دل میں اس نظام سے نفرت اور اس کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا ہو۔

ظفر: مگر اس میں نئی بات کیا ہوئی پہلے بھی ادب میں ان برائیوں کا ذکر ہوتا تھا اور اُن کا انجام برا دکھایا جاتا تھا۔

اکرام اللہ: پہلے صرف اُن برائیوں کو بُرا کہا جاتا تھا جو سماج یعنی اونچے طبقوں کے بتائے ہوئے مذہب، اخلاق، قانون کے خلاف تھیں جن برائیوں کو سماج نے رکھا تھا بلکہ خود پیدا کیا تھا اُن کا تو ذکر نہیں آتا تھا یا اُن پر تاویل کا پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

ہردیال: آپ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی نئے ادیبوں میں شامل ہیں۔۔ یہ تو بتائیے آپ کمیونسٹ ہیں یا سوشلسٹ؟

اکرام اللہ: ارے بھئی میرا کیا ذکر ہے میں نہ تو یہ 'اسٹ' ہوں نہ وہ 'اسٹ' نہ نیا ادیب نہ پرانا ادیب۔ میں تو ایک زمیندار کا کارندہ ہوں۔

ظفر: ادیب نہیں تو کم سے کم نقاد آپ ضرور ہیں۔ اس نئے ادب کے حلقے میں کیسے کیسے لکھنے والے ہیں؟

اکرام اللہ: ظاہر ہے ابھی سب نومشق ہیں مگر ان میں سے دو ایک ہونہار معلوم ہوتے ہیں۔ سب سے بڑی کمی مشاہدے کی ہے۔ خصوصاً مزدوروں اور کسانوں کی زندگی سے بالکل واقف نہیں۔ محض تخیل سے یا سُنی سنائی باتوں سے کام لیتے ہیں۔

ہردیال: آپ تو کسانوں کی زندگی کو قریب سے دیکھا ہوگا۔ اگر آپ اس پر لکھیں گے تو مزہ آجائے گا۔

اکرام اللہ: بھائی رحم کرو، مجھے کیوں کچوکے دیتے ہو۔ تمہیں یاد ہوگا کہ جس دن تم لوگ یہاں آئے تھے میں نے تم سے کہا تھا کہ میں خوش نظر آتا ہوں مگر دراصل خوش نہیں ہوں اسکی وجہ یہ ہے کہ میری زندگی سراپا شکست ہے اور میں نے شکست کو چھپانے کے لئے پردہ ڈال رکھا ہے۔

ہردیال: میری گستاخی آپ کو ناگوار گزری ہو تو معافی چاہتا ہوں۔ مگر میں نے سچے دل سے یہ بات کہی تھی۔ طنز کا خیال تک نہ تھا۔

اکرام اللہ: سچی بات طنز سے زیادہ چبھتی ہے۔ مگر تم سے شکایت نہیں، تم نے تو اپنے خیال میں میری تعریف کی۔ بات یہ ہے کہ مجھے شعر و ادب کا فطری ذوق ہے مگر اسکول کی تعلیم کے زمانے میں کچھ تو والد مرحوم کی کڑی نگرانی اور کچھ امتحانوں میں اول آنے کے شوق نے اسے دبائے رکھا۔ کالج میں جیسے میں خود آوارہ گردی میں پڑ گیا اسی طرح میرا ذوق ادب بھی آوارہ ہو کر رہ گیا یعنی مشاعروں کی شرکت اور سطحی ناولوں اور افسانوں کے مطالعہ تک محدود ہو گیا۔ عملی زندگی میں داخل ہوا تو ایسا ماحول ملا جس میں یہ پنپ ہی نہیں سکتا تھا۔ پہلے دل کو سمجھاتا رہا کہ چند سال کے بعد اس ماحول سے نکل کر آزادی کی فضا میں اپنی پسند کی زندگی بسر کروں گا۔ لیکن وقت گذرتا گیا اور جو لباس میرے جسم پر زبردستی منڈھا گیا تھا وہ ایسا چمٹا کہ اتارے نہیں اُترتا۔

ہردیال: مگر آپ کی دلچسپی سیاست سے نہیں ادب سے ہے۔ آپ کی ملازمت آپ کو سیاست میں شریک ہونے سے ضرور روکتی ہے مگر ادبی کاموں میں تو کوئی خاص رکاوٹ نہیں معلوم ہوتی۔

اکرام اللہ: ہاں غزل کہنے اور ادب لطیف چھانٹنے میں تو اس کے سوا کوئی رکاوٹ نہیں کہ رئیس کی نوکری چوبیس گھنٹے کی غلامی ہے جس میں مرنے کی بھی فرصت نہیں۔ لیکن ترقی پسند ادب کا دامن سیاست سے بندھا ہوا ہے۔ اس میں عملی حصہ لینے کی فرصت بھی ہو تو ہمت نہیں ہو سکتی۔ جب میں نئے ادب کے حلقے میں شریک ہوا تھا اور نوجوانوں کی نظمیں اور افسانے سنتا تھا جس میں کسانوں کی مظلومی اور زمینداروں کے ظلم، مہاجنوں کی بیدردی اور پولیس کی بے ایمانی کی خیالی داستانیں ہوتی تھیں تو میرا دل تڑپتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر، راتوں کو جاگ کر دیہات کی عبرت ناک زندگی کی جیتی جاگتی، چلتی پھرتی تصویریں دکھاؤں۔ مگر ایک تو لکھنے کی مشق نہیں اور یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا کہ قلم اُٹھا کر اُوٹ پٹانگ لکھنا شروع کر دوں۔ دوسرے گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے مگر اس کو کیا کرے کہ اُس کا اپنا گھر بار، بال بچے سب کچھ لنکا میں ہے۔ زمینداروں کا نوکر ٹھیرا۔ مہاجنوں سے روز کا بیوپار، پولیس اور حکام سے ہر وقت کا واسطہ، ان سے بگاڑ کر کہاں جاؤں۔ سچ پوچھو تو میں نے حلقے کے جلسوں میں جانا اسی وجہ سے چھوڑ دیا کہ جس راستے پر آدمی دُور تک نہ جا سکے اس پر قدم رکھنے سے کیا فائدہ۔

ظفر: آخر آپ اس ملازمت کو جس سے اسقدر بیزار ہیں چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟

اکرام اللہ: بھئی کیا بتاؤں میری خودغرضی، کم ہمتی۔ سوچتا ہوں کہ ایف اے تک پاس نہیں، سرکاری نوکری کی عمر نہیں اور ہوتی بھی تو تیس چالیس کی کلرکی سے زیادہ کیا ملتی، تجارت کے لئے روپیہ نہیں، کوئی صنعت کوئی ہنر آتا نہیں، خود کیا کھاؤں گا اور بچوں کو کیا کھلاؤں گا۔ اس کے علاوہ پشتوں سے میرے بزرگ ریاست کی خدمت کررہے ہیں، نواب صاحب مجھے حقیقی بیٹے کی طرح سمجھتے ہیں۔ انھیں کیسے چھوڑ دوں، پھر خیال آتا ہے کہ میری وجہ سے کم سے کم ایک علاقے میں کسانوں کی حالت غنیمت ہے۔ ریاست کے کارندے تحصیل اور پولیس کے لوگ انھیں نہیں ستا سکتے، بیگار ان سے نہیں لی جاتی، طرح طرح کے نذرانے نہیں وصول کیے جاتے۔ کچھ عرصے بعد منیجر ہوگیا تو پوری ریاست میں یہی طریقہ رائج کردوں گا۔

ظفر: جب آپ غریب کسانوں کو اتنا فائدہ پہنچا سکتے ہیں تو اس زندگی کو بہت غنیمت سمجھئے اور اپنے ادبی حوصلوں کو اس پر قربان کردیجئے (کچھ گھبرا کر) معاف کیجئے گا میں نے بے جا جسارت سے کام لیا۔

اکرام اللہ: بے جا جسارت، بے جا حجاب سے بہر حال اچھی ہے۔ بھئی مشکل تو یہی ہے کہ کسانوں کو فائدہ بالکل نہیں پہنچا سکتا، زیادہ سے زیادہ نقصان سے بچا سکتا ہوں اور وہ بھی ہر نقصان سے نہیں، سود خور مہاجن سے نہیں، فصل کی خرابی سے نہیں، بھوک سے نہیں، ملیریا سے نہیں۔ میں نے چاہا کہ ان کے لئے امداد باہمی کے بینک قائم ہوں، ان کو اچھے بیج دئے جائیں، حفظان صحت کا، تعلیم کا انتظام کیا جائے مگر ایک نہ چلی۔ نواب صاحب نیک دل اور ہمدرد آدمی ہیں۔ خیرات دل کھول کر دیتے ہیں، غریب لڑکیوں کی شادی کے لئے، بیماروں کے علاج کے لئے، مسجد، دھرم شالہ کو پیسے دینے کو تیار ہوجاتے ہیں مگر رفاہِ عام کے کاموں کو وہ اپنا فرض نہیں حکومت کا فرض سمجھتے ہیں۔ حکومت کے ارباب حل وعقد تک میری رسائی نہیں۔ ضلع کے حکام تک پہنچ سکتا ہوں۔ سو اُن کا یہ حال ہے کہ انھیں مال گذاری وصول کرنے اور کانگریس کی تحریک کو دبانے کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہیں اور چونکہ میرے کانگریس والوں سے گہرے تعلقات ہیں اس لئے مجھ سے خار کھاتے ہیں۔

ہردیال: اور نواب صاحب اس سے ناراض نہیں ہوتے کہ آپ کانگریس والوں سے میل جول رکھتے ہیں۔

اکرام اللہ: ہمارے نواب صاحب کو غم صیاد وفکر باغباں ہے۔ انگریزوں کے سلامی تو ہیں ہی مگر کانگریس سے بھی نہیں بگاڑنا چاہتے۔ انگریز اُن کا خطاب، اعزاز، منصب چھین سکتے ہیں تو کانگریس والے کسانوں کو بھڑکا سکتے ہیں۔ خود تو ان میں اتنی ہمت نہیں کہ کانگریس کے لیڈروں سے ملیں۔ مگر میرے ان سے جو تعلقات ہیں انھیں غنیمت سمجھتے ہیں کہ شاید کسی وقت کام آجائیں۔ مجھے اُن کا کوئی کام نکالنے کے لئے اپنی عزتِ نفس کو قربان کرکے اُن حاکموں کی بارگاہ کا طواف کرنا پڑتا ہے جو مجھے شبہ کی اور ذلت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ غرض ایک کشمکش میں زندگی گزرتی ہے، نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے (گھڑی دیکھ کر) بھئی باتوں میں گیارہ بج گئے تم کو ابھی اپنا کام کرنا ہے اور صبح اُٹھنا ہے۔ خدا حافظ۔

صرف ظفر نہیں بلکہ ہردیال جیسا بے فکرا بھی اس گفتگو سے بہت متاثر ہوا اُن کو اس احساس سے سخت دھچکہ لگا کہ زندگی ایک قُوت کے سہارے ایک خطِ مستقیم پر حرکت نہیں کرتی بلکہ مختلف اور متضاد قوتوں کے عمل سے گھن چکر بن جاتی ہے۔ دونوں خاموش فکر میں ڈوبے ہوئے اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

دوسرے دن شام کو چھ بجے، یہ دونوں دوست جارج ٹاؤن کی ایک سڑک پر راج نرائن صاحب کا مکان تلاش کررہے تھے دوسری طرف سے انھیں ایک عجیب وغریب ہئیت کا نوجوان آتا ہوا نظر آیا۔ دبلا پتلا، پستہ قد، چہرہ نسبتاً بڑا، رنگ زردی مائل، آنکھیں چھوٹی مگر ابھری ہوئیں، سر پر پٹے، ٹوپی ندارد، قمیص، بغیر بٹن کا کوٹ اور ڈھیلی مہری کا پاجامہ پہنے، پاؤں میں چپل، ایک ٹانگ سے لنگڑاتا چلا آرہا تھا۔ ان دونوں کو ادھر اُدھر کے مکانوں کے نمبروں پر نظر ڈالتے دیکھ کر وہ تیزی سے بڑھکر ان کی طرف آیا اور پوچھا ''کیا آپ راج نرائن صاحب کا بنگلہ تلاش کررہے ہیں''

ہردیال: جی ہاں ہمیں اس سڑک پر نمبر 7 کا پتہ دیا گیا تھا مگر نمبر 6 کے بعد نمبر 8 آگیا سات کا کہیں پتہ نہیں۔

اجنبی: نمبر 6 کے پھاٹک کے اندر سے راستہ جاتا ہے اور مکان کسی قدر دور نمبر 6 کی پشت پر ہے، آئیے آپ میرے ساتھ چلئے میں بھی وہیں جارہا ہوں۔

ہردیال اور ظفر مُڑ کر اجنبی کے ساتھ ہولئے۔ ہردیال نے پوچھا ''آپ کا اسم شریف''۔

اجنبی: مجھے اخگر کہتے ہیں

ہردیال: یہ تو آپ کا تخلص ہوا۔ نام کیا ہے

اخگر: تخلص نام جو کچھ سمجھئے یہی ہے۔

ہردیال: نام میں بھی آپ نے کفایت برتی، بہت اچھی بات ہے۔

اخگر: آپ دونوں کی تعریف؟

ہردیال: میرا نام ہردیال ہے اور ان کا نام ظفر حسن ہے۔ ہم دونوں گورنمنٹ کالج میں فرسٹ ایر میں پڑھتے ہیں۔

اخگر: پہلے آپ کو حلقے میں دیکھا نہیں شاید ابھی داخل ہوئے ہیں؟

ہردیال: جی آج پہلی بار دخل در معقولات کے لئے جارہے ہیں۔

اخگر ایک ٹانگ پر پھدکتا ہوا اس تیزی سے چل رہا تھا کہ اُن دونوں کو ساتھ دینا دشوار ہوگیا۔ راج نرائن صاحب کے بنگلے پر پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ باہر لان پر دو بڑی میزیں رکھی ہیں اُن کے گرد کرسیوں پر دس بارہ نوجوان بیٹھے ہیں اور ''ٹھنڈائی'' یعنی لیمنیڈ وغیرہ کا دور چل رہا ہے۔ اُن میں سے ایک نے، اخگر کو دیکھ کر کہا ''لیجئے وہ تیمور کو چک آگئے آج تو دو اور قیچی قیوں کو پکڑ لائے ہیں'' اقبال بہادر اور بال کرشن نے آگے بڑھ کر ظفر اور ہردیال کا استقبال کیا اور اُن کا سب سے تعارف کرایا۔ نو واردوں کی تواضع ٹھنڈائی سے کی گئی۔ سگریٹ پیش کئے گئے، تینوں نے شکریہ کے ساتھ انکار کیا۔ ظفر اور ہردیال تو تمباکو پیتے ہی نہ تھے۔ اخگر کو سگریٹ کی نہیں بلکہ بیڑی کی عادت تھی چنانچہ اس نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی اور سب کی طرف مبارزانہ انداز سے دیکھ کر پینی شروع کردی۔ ایک نوجوان کی تحریک پر اقبال بہادر جلسے کا صدر منتخب ہوا۔ اُس نے اسی کُرسی کو ذرا پیچھے کھسکا کر کُرسی صدارت بنالیا۔ ایک موٹا گورے رنگ کا ہنس مکھ نوجوان جس کا چہرہ چیچک کے داغوں سے لپا ہوا ہونے کے باوجود خاصا دلکش تھا، اپنی کرسی کو اٹھا کر صدر کے قریب لے آیا اور ایک کاغذ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ صدر نے کہا ''حضرات آج ہمیں

دیر ہوگئی ہے اور جلسہ اندھیرا ہونے سے پہلے ختم کرنا ہے، اس لئے کہ اس گھر میں جس پر ہم نے قبضۂ غاصبانہ کر رکھا ہے، دعوت ہونے والی ہے، ہماری نہیں بلکہ وکیلوں کی۔ اگر سورج ڈوبنے کے بعد ہم یہاں پائے گئے تو نہ جانے ہم پر مداخلتِ بے جا کا مقدمہ چل جائے یا ہمیں حبسِ بے جا یا ضربِ شدید کا مقدمہ چلانا پڑے۔ بہر حال پچھلے جلسے کی کارروائی کا پڑھنا ملتوی کیا جاتا ہے اور اس جلسے کی کاروائی شروع ہوتی ہے۔ سب سے پہلے مختار علی صاحب اپنا مختصر افسانہ ''گڑیا'' سنائیں گے۔

مختار علی صاحب کا رنگ کالا چمک دار اور نقشہ بھدّا تھا جس کی تلافی کے لئے وہ بالوں کی آرائش اور لباس کی زیبائش میں غیر معمولی اہتمام کرتا تھا مگر حُسن ذوق سے محروم ہونے کی وجہ سے بھڑکیلے ہندوستانی لباس میں ایکٹر سا بن کر رہ گیا تھا۔ اس کے افسانے میں آورد اور تصنع کا رنگ زیادہ تھا۔ یہ ایک امیر گھر کی لڑکی کی کہانی تھی جس کا بچپن میں اس قدر لاڈ پیار کیا جاتا تھا کہ وہ زندگی کو ایک گھروندا اور اپنے آپ کو ایک گڑیا سمجھنے لگی۔ جوان ہو کر وہ ایک ادھیڑ عمر کے سنجیدہ مزاج مصنف سے بیاہ دی گئی جو اس سے یہ توقع رکھتا تھا کہ گھر کی ذمہ داریوں کو سنبھالے اور اس کے کام کے لیے امن و سکون کی فضا پیدا کر دے۔ مگر گڑیا چاہتی تھی کہ کوئی ہر وقت اس سے کھیلتا رہے چنانچہ شوہر کے دوستوں میں ایک کھلاڑی مل گیا جس نے اُسکے شوق کو اچھی طرح پورا کیا۔ شوہر کو جب معلوم ہوا تو باوجود اس کے کہ وہ قدامت پسند ادیب تھا اس نے ترقی پسندی سے کام لیا اور بیوی کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو قصوروار ٹھہرایا کہ عمر اور طبیعت کے فرق کو نظر انداز کر کے محض خوبصورتی کی وجہ سے ایک گڑیا سے شادی کر لی۔ افسانے کا انجام قیاس پر چھوڑ دیا گیا تھا، زبان اچھی خاصی تھی مگر جا بجا انگریزی محاورں کے لفظی ترجمے کھٹکتے تھے۔ کردار بے جان تھے خصوصاً گڑیا محض گڑیا تھی اس میں انسانیت یا نسائیت کی کوئی ادا نہیں پائی جاتی تھی۔ افسانے کا مقصد غالباً لڑکیوں کو ناقص تربیت اور بے جوڑ شادی کے خراب نتائج کو دکھانا تھا۔ مگر گڈے گڑیا کا کھیل اس ذوق و شوق سے دکھایا گیا تھا کہ اصل مقصد وہی بن گیا تھا۔

اس کے بعد صدر نے رفیع الدین صاحب کو اپنا افسانہ ''جدید ضحاک'' سنانے کے لئے بلایا۔ ایک خوش قامت، خوش رو، نوجوان ڈھاکے کی سلک کا نفیس سوٹ پہنے آیا اور اس نے بارک سریلی آواز میں افسانہ پڑھنا شروع کیا جس میں ضحاک کی روایت سے استفادہ کر کے ایک زمیندار کا قصہ بیان کیا گیا تھا۔ چودھری ظالم سنگھ کے پیٹ میں ایک پھوڑا ہے جس کی وجہ سے اس کے جسم میں خون اس قدر گھٹ گیا ہے کہ جان کے لالے پڑ گئے ہیں۔ ڈاکٹر مرض کو لاعلاج بتاتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ اگر روز تازہ تازہ خون اس کے جسم میں داخل ہوتا رہے تو وہ مدّت تک زندہ رہ سکتا ہے۔ چنانچہ ظالم سنگھ کی رعایا میں سے روزکئی اشخاص کے خون کا معائنہ ہوتا ہے اور جس کا نمبر ملتا ہے چاہے وہ مرد ہو کہ عورت، بوڑھا ہو یا جوان یا بچہ اس کی رگوں میں سے خون لے کر ظالم سنگھ کے چڑھا دیا جاتا ہے۔ اس کا رنگ بدستور سرخ رہتا ہے اور رعایا کا روز بہ روز زرد ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ رعایا ایک نوجوان باغی الدین کی سرکردگی میں زمیندار کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اس کے مکان پر حملہ کر دیتی ہے۔ باغی الدین ایک جرّاح کا نشتر لے کر ظالم سنگھ کی فصد کھولنا چاہتا ہے۔ گاؤں کے مولوی طفیل بخش آ کر اس کو سمجھاتے ہیں کہ شرع کی رو سے اس طرح خون بہانا جائز نہیں۔ باغی الدین جواب دیتا ہے کہ میں اس خون کا ایک قطرہ بھی نہیں لینا چاہتا، میں تو اپنے بھائیوں کا خون واپس لوں گا۔ خون بہنے سے ظالم سنگھ مر جاتا ہے اور مظلوموں کے دل میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے۔ قصے کا پلاٹ اچھا تھا، کردار نگاری بھی غنیمت تھی مگر زبان کی غلطیاں بہت تھیں۔ غالباً ظفر کے سوا کسی کو ان کا زیادہ احساس نہیں ہوا اس لیے افسانہ ختم ہونے کے بعد زور شور سے تالیاں بجا کر داد دی گئی۔

اس کے بعد ایک دبلے پتلے کشمیری نوجوان کیلاش ناتھ کی باری آئی جس کے خوبصورت چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ اس نے ''اردو شاعری کے معشوق'' کے عنوان سے ایک تنقیدی مضمون پڑھا جس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہمارے شاعروں کا بانکا، تیغ زن معشوق، جلاّد، دراصل سامنتی عہد کے سپاہی جاگیردار کا مجسم تصور ہے اور بے بس، بے عذر، ظلم پسند عاشق اس عہد کے ایک غریب عامی کا عکس ہے۔ سارا مضمون محض غزل کے شعروں کی حسب منشا تاویل پر مبنی تھا اس لئے اسکی تاریخی قدر و قیمت جو کچھ بھی تھی وہ ظاہر ہے لیکن ادبی لطیفے کی حیثیت سے اچھا تھا۔ سننے والے جس طرح مسکراتے ہنستے رہے اس سے معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے بھی اس کو بہت سنجیدہ چیز نہیں سمجھا۔

آخر میں حضرت اخگر کھڑے ہوئے تو پہلے ہی سے زور و شور سے تالیاں بجنے لگیں۔ جب تالیاں رکیں تو اخگر نے کہا ''جناب صدر آج کی نظم کا عنوان ہے'' انگارہ ہوں انگارہ''۔ اس پر پھر فضا تالیوں کے شور سے گونج اٹھی۔ کئی نوجوان رعب دار آواز میں ''گا'' کی آواز کو کھینچ کر چنگھاڑے ''انگارہ ہوں انگارہ'' دو ایک نے باریک آواز میں کہا ''چنگاری ہوں چنگاری''۔ اخگر نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی اور اپنی نظم بلند آواز میں تحت اللفظ پڑھنی شروع کر دی۔ یہ ایک ترجیع بند تھا کہ جس کے کسی بند میں اخگر نے سرمایہ داروں کے دیو کو مخاطب کیا تھا، کسی میں سامراج کے راکھشس کو، کسی میں رسمی مذہب کے جن کو، کسی میں رواجی اخلاق کے بھوت کو، اور ہر بند کے آخر میں یہ ٹیپ آئی تھی ''میں تجھ کو پھونک ڈالوں گا، جلا کر خاک کر دوں گا'' ٹیپ کو وہ اور بھی گرج کر پڑھتا تھا اور ''پھونک'' کے لفظ کو زور سے دانت بھینچ کر ادا کرتا تھا۔ جو لوگ پیچھے دوسروں کی آڑ میں بیٹھے تھے وہ ''پھو'' کی آواز نکالتے تھے گویا انگارے کو دہکا رہے ہوں۔ نظم ختم ہوتے ہی تمسخر کے انداز میں تال سے تالی بجنے لگی اور کئی منٹ تک بجتی رہی۔ اخگر سارے جسم کا زور لگا کر پڑھنے سے شل ہو گیا تھا مگر اس کے چہرے سے فتح مندی کے آثار ظاہر تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے یقین ہے کہ مشاعرہ اُسی کے ہاتھ رہا۔ صدر نے پڑھنے والوں اور سننے والوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اگلے جلسے کے وقت اور مقام کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

جلسہ منتشر ہو گیا۔ ظفر اور ہردیال بھی اقبال بہادر کا شکریہ ادا کر کے اور سب سے رخصت ہو کر اپنے گھر کی طرف چلے۔ ہردیال نے کہا ''بھئی بڑا لطف رہا خصوصاً چنگاری کے انگارے نے بڑا مزا دیا'' ظفر جو ادب کو تفریحی مشغلہ نہیں بلکہ ایک طرح کی عبادت سمجھتا تھا سارے جلسے کے دوران میں سخت جز بز بیٹھا رہا تھا۔ ایک طرف تو اسے اُن نئے ادیبوں کی مذہب، اخلاق، قانون اور رومان سے ''بے ادبیاں'' دھچکے پہ دھچکا پہنچا رہی تھیں دوسری طرف سننے والوں کی خفیف الحرکاتی سے کوفت ہو رہی تھی خصوصاً بے چارے اخگر کا لوگ جس طرح مذاق اُڑا رہے تھے وہ اسے بہت ہی بُرا معلوم ہوا۔ ہردیال کی بات پر اس کے ضبط کا بندٹوٹ گیا۔ اس نے کہا:

''لطف تو تمہیں آیا ہوگا مجھے تو بے طرح غصہ آ رہا تھا۔ سخت نامعقول لوگ معلوم ہوتے ہیں اُس غریب اخگر کے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے تھے۔ محض اس لئے کہ وہ بدہئیت

اورغریب ہے۔ حالانکہ ان میں سے اگر کوئی اپنے خیالات اور جذبات میں مخلص ہے تو وہی ہے، اگر کسی کو ادب سے مَس ہے تو اسی کو ہے۔ خیالات جیسے بھی ہوں مگر طبیعت موزوں ہے، زبان میں صفائی اور کلام میں زور ہے۔ اور سب زبردستی ادب میں اپنی ٹانگ اڑاتے ہیں۔

ہردیال: تمہارے خیال میں اس لنگڑے کے سوا کسی کو ادب میں ٹانگ اڑانے کا حق نہیں۔ تم اس کے بڑے حمایتی بن گئے، غریب ہو یا امیر جو بنتا ہے اسے ضرور بنائیں گے اور۔۔ یہ تمہاری سراسر دھاندلی ہے کہ اور کسی کو ادب سے مَس نہیں۔ گڈے گڑیا کی کہانی بے شک مہمل تھی مگر وہ ظالم سنگھ والا قصہ بڑے زور کا تھا۔ خصوصاً باغی الدین نے مولوی کو جواب خوب دیا کہ ہم اس کا خون نہیں چاہتے، صرف اپنا خون واپس لیں گے۔

ظفر: افسانہ بے شک اچھا تھا مگر میرے تو اس خونخواری اور بے دینی کی باتوں سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں

ہردیال: یہی تو لکھنے والا چاہتا ہے کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔

ظفر: اجی یہ مطلب نہیں بلکہ لکھنے والے کے خیالات سے کراہت معلوم ہوتی ہے۔ کسی نے اس باغی سے یہ نہ کہا کہ ظالم سنگھ کی فصد لینے کی ضرورت نہیں بس اسے خون دینا بند کر دو۔ آپ ہی مر جائے گا۔

ہردیال: ہاں یہ تم نے خوب بات کہی۔ مہاتما گاندھی کے اہنسا اور ستیا گرہ کا نچوڑ ایک جملے میں آ گیا۔ اچھا وہ اردو شاعری کا معشوق کیسا دلچسپ مضمون تھا۔

ظفر: مضمون کیا تھا مسخرا پن تھا

ہردیال: تو مسخرا پن کون سا گناہ ہے۔ تم جیسے چوبِ خشک کا ذکر نہیں اور ہم سب کو تو بڑا مزہ آیا۔

ظفر: ارے بھئی تم کو مزہ آیا مگر اُس نے تفریح کے لئے تھوڑا ہی لکھا تھا، اس نے اپنے نزدیک تاریخی تحقیق اور ادبی تنقید کی داد دی ہے۔

ہردیال: تم ہو بدھو۔ وہ بہت تیز لڑکا ہے۔ تم زمین پر چیونٹیاں گن رہے تھے تم نے دیکھا نہیں کہ وہ بہت سنجیدہ چہرے بنانے کی کوشش کر رہا تھا مگر مسکراہٹ آ ہی جاتی تھی۔

ظفر: خیر بھئی ہوگا۔ میرا تو اس نئے ادب کو دور سے سلام جوُتوں کے ساتھ کعبے کو بھی ڈھا دینا چاہتا ہے۔ میں اب کبھی ان لوگوں کے جلسوں میں نہیں جانے کا۔

ہردیال: میں کعبہ اور بُت خانہ تو جانتا نہیں اتنا جانتا ہوں کہ جلسہ بڑے مزے کا تھا۔ مگر تم نہیں جاؤ گے تو میں بھی نہیں جاؤں گا۔ میرے پیٹ میں کون سا ایسا ادب کا درد اٹھتا ہے۔ سچی بات ہے کہ مجھے یہ حلقہ زیادہ تر اس وجہ سے پسند آیا کہ اس میں ہندو مسلمان نوجوان گھل مل کر رہتے ہیں یہ آج کل بڑی بات ہے۔

ابراہیم منزل پہنچ کر ان دونوں کو معلوم ہوا کہ اکرام اللہ شام کی گاڑی سے گھر چلے گئے ورنہ ان سے جلسے پر تبصرہ اور بحث ہوتی۔ کھانے کے بعد ظفر اس خیال سے کہ کل اتوار ہے تھوڑا سا مطالعہ کر کے جلد سونے کو لیٹ گیا۔ جن نوجوانوں سے آج ملاقات ہوئی تھی ان کی صورتیں اس کی آنکھوں میں اور جنھوں نے مضامین پڑھے تھے ان کے خیالات دیر تک اسکے دماغ میں پھرتے رہے اور وہ بڑی سختی سے ان پر نکتہ چینی کرتا رہا۔ جب آنکھ لگ گئی تو گڑیا کی کہانی سے ملتا جلتا خواب دیکھنے لگا۔

☆☆☆

وفیات

مقبول عام فلمی اور ادبی ماہنامہ 'شمع' کے سابق ایڈیٹر **محمد یونس دہلوی** کا 7 فروری 2019 کا گڑگاؤں میں طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ وہ 89 سال کے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ زینت کوثر دہلوی کے علاوہ ایک بیٹی سعدیہ دہلوی اور بیٹا وسیم دہلوی شامل ہیں، ان کے دو چھوٹے بھائیوں ادریس دہلوی اور الیاس دہلوی کا پہلے ہی انتقال ہو چکا ہے۔ یونس دہلوی 'شمع' کے بانی حافظ محمد یوسف دہلوی کے بڑے بیٹے تھے اور انہوں نے 'شمع' کو مقبول عام رسالہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ان کے ادارے سے اپنے زمانے کے معروف جریدے 'بانو، شبستاں، کھلونا، مجرم' اور ہندی میں 'سشما' بھی شائع ہوتے تھے۔ 'شمع' کو ادبی معموں کے سبب بھی خاص مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔

پاکستان کی مشہور و ممتاز افسانہ و ناول نگار **خالدہ حسین** کا 11 جنوری 2019 کو 81 برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین اسلام آباد میں عمل میں آئی۔ خالدہ حسین 18 جولائی 1938 کو لاہور میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں پہچان، دروازہ، مصروف عورت، جینے کی پابندیاں، خواب ہیں ہنوز اور میں یہاں ہوں شامل ہیں۔ انہوں نے ایک ناول 'کاغذی گھاٹ' بھی تصنیف کیا تھا۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے انہیں 14 اگست 2005 کو صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے سرفراز کیا تھا۔

اردو کے معروف شاعر **قاضی احتشام بچھرایونی** کا طویل علالت کے بعد 12 جنوری 2019 کو 84 برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم کے پسماندگان میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی شامل ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ 'کیف غزل' منظر عام پر آ کر مقبول ہو چکا ہے۔ قاضی صاحب کی شاعری کا سفر منظر ہلدوری سے شروع ہوا، ان کے بعد رئیس نیازی بچھرایونی اور اپنے زمانے کے مشہور شاعر کیف بھوپالی سے بھی شرف تلمذ حاصل کیا۔

معروف شاعر اور نغمہ نگار **اخلاق ساگری** کا 22 دسمبر 2018 کو مدھیہ پردیش کے شہر ساگر میں واقع ان کی رہائش گاہ پر انتقال ہوگیا۔ وہ طویل عرصے سے بیمار تھے۔ اخلاق ساگری 30 جنوری 1930 کو پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے گزشتہ 70 برسوں سے ہندی اور اردو ادب میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ فلم 'صنم بے وفا' کے ہٹ گانے ''عشق میں ہم کیا بتائیں، کس قدر چوٹ کھائے ہوئے ہیں'' سے انہیں کافی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی پہلی خاتون ممبر و ادیبہ اور سماجی کارکن **ڈاکٹر نسیم اقتدار علی** کو 20 جنوری 2019 کو بعد نماز ظہر محلّہ باڑوزئی اول واقع عثمان باغ میں غمگین ماحول میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ انہیں اردو زبان و ادب سے گہرا شغف تھا۔ 2014 میں مضامین کے دو مجموعے 'دیدہ وشنیدہ' اور 'دھوپ چھاؤں چہرے' شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ بھی ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آئیں۔

اردو ادب کے عظیم شعرا اصغر و جگر کی روایتوں کے امین کوچۂ جگر کے روح رواں بزرگ شاعر و ادیب **قمرالدین خاں** (قمر گونڈوی) نے طویل علالت کے بعد 29 اکتوبر کو الوداع کہہ دیا اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ ان کا انتقال گونڈہ ضلع اسپتال میں دل کا دورہ پڑنے سے ہوا۔ وہ تقریباً دو سال سے لقوے کی زد میں تھے اور زیر علاج تھے۔ ان کی عمر تقریباً 84 سال تھی۔

ادارہ مرحومین کیلئے دعائے مغفرت اور پسماندگان کیلئے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔

محمد غالب نشتر

اقبال مجید کا 'خاموش مکالمہ'

جدیدیت کی علمبردار خالدہ حسین کے انتقال کی خبر پوری ادبی دنیا میں پھیل ہی رہی تھی کہ 18 جنوری 2019 کو یہ خبر بھوپال سے خاص وعام میں مشتہر ہوئی کہ اقبال مجید بھی اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ کانوں کو یقین نہ آیا تو بھوپال میں ان سے قریبی ادب نواز حضرات سے رابطہ کیا تو ضیا فاروقی اور رشید انجم نے اس اطلاع کو صحیح قرار دیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اردو کی محدود دنیا، اب واقعی محدود تر ہونے لگی ہے۔ ایک طرف ہمارے بزرگوں کے داغِ مفارقت دینے کا سلسلہ طول پکڑتا جارہا ہے تو دوسری جانب یہ شکایت بھی بجا ہے کہ تخلیقی ذہنوں کا اردو ادب میں اب فقدان ہوتا جارہا ہے۔ اگر صورتحال یہی رہی تو آئندہ بیس پچیس سالوں میں اردو ادب ناقد تو پیدا کرلے گا لیکن اسے ایسے فن پارے نصیب نہ ہوں گے جن کی بنیاد پر تنقید کی روح کا دار ومدار ہے۔ ہندستان میں عابد سہیل، اقبال مجید اور رتن سنگھ ترقی پسندی کے حوالے سے خاصے مقبول بھی ہوئے۔ لے دے کر اب رتن سنگھ رہ گئے ہیں، اللہ انھیں سلامت رکھے۔ پچھلے دنوں جب بھوپال جانا ہوا تو اقبال مجید کے آستانے پر حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ ساتھ میں ضیا فاروقی تھے جو آفس کے کام چھوڑ کر بھٹکے کو راہ دکھانے ہمارے ساتھ تھے۔ ملاقات خاصی طویل رہی۔ اس ملاقات کا تأثر بیان کرتے ہوئے اقبال مجید نے اس بات کا اظہار کیا کہ ایک زمانے کے بعد فکشن کے معاصر منظرنامے پر بات کرتے ہوئے اچھا محسوس ہورہا ہے۔ اس جملے میں ایک خاص طرح کا وزن تھا اور ایسا قطعی محسوس نہیں ہورہا تھا کہ وہ ہمیں اتنی جلدی داغ مفارقت دے جائیں گے۔ اللہ انھیں غریق رحمت کرے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

اقبال مجید 12 جولائی 1934 کو مرادآباد میں پیدا ہوئے لیکن آبائی مکان چودھری گڑھیا نام کے محلے میں واقع ہے جو لکھنؤ کا علاقہ ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اس کے بعد 1951 میں ہائی اسکول، 1953 میں انٹرمیڈیٹ اور 1956 میں لکھنؤ یونی ورسٹی سے بی اے کیا۔ اسی زمانے میں وہ لکھنؤ کے ترقی پسند مصنفین کی نشستوں میں شریک ہوتے تھے۔ ہم عصروں میں کمال احمد صدیقی، رتن سنگھ، محمد حسن اور آل احمد سرور سے ملاقات کا شرف انہی نشستوں میں ہوتا تھا۔ لکھنؤ کے ادبی ماحول سے انہیں اتنا گہرا لگاؤ ہوگیا تھا کہ علی گڑھ میں بی ایڈ میں داخلہ ہونے کے باوجود وہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ کس طرح لکھنؤ کی سجی سجائی بزم کو چھوڑ کر کہیں اور کا رخ کیا جائے۔ بالآخر دوستوں کے مشورے پر 1957 میں علی گڑھ آئے اور 1958 میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ تعلیم سے بی ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد اُن کا تقرر آل انڈیا ریڈیو، بھوپال میں ہوا۔ کئی تبادلوں کے بعد بالآخر انہوں نے بھوپال کو اپنا مسکن بنایا۔ اقبال مجید نے شاعری کے راستے ادبی دنیا میں قدم رکھا اور ''مجرم'' تخلص اختیار کیا۔ اس کے بعد افسانہ نگاری کی جانب پوری توجہ مبذول کی۔ انھوں نے افسانہ نویسی کی ابتدا پچاس کی دہائی میں کردی تھی اور اُن کا پہلا افسانہ ''عدو چاچا'' 1956 میں ''شاہراہ'' دہلی میں شائع ہوا جس کے مدیر ظ۔ انصاری (ظل حسنین انصاری) تھے۔ یہ افسانہ ایک کردار کو سامنے رکھ کر لکھا گیا تھا۔ افسانہ نگاری کی جانب مائل ہونے میں اے حمید اور شفیق الرحمٰن کے سنجیدہ افسانے اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اُن کی تربیت ہوئی جس کا اعتراف انہوں نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ ''میری ادبی تربیت ترقی پسند تحریک کے زیر سایہ ہوئی لیکن میں وہ ڈربوک ترقی پسند نہ تھا جس کا افسانہ ''شب خون'' میں چھپنے سے ترقی پسندوں کا دھرم بھرشٹ ہوجاتا ہے''۔

اقبال مجید لکھنؤ کے ادبی ماحول میں افسانہ نویسی کی ابتدا کر چکے تھے۔ ان کے دوستوں میں رتن سنگھ اور عابد سہیل وغیرہ بھی افسانوی دنیا میں اپنی شناخت قائم کرنے میں سرگرداں تھے۔ بہ حیثیت مجموعی لکھنؤ کا ادبی ماحول اپنے شباب پر تھا لیکن اقبال مجید نے لکھنؤ کی محفل سے الگ رہ کر بھی ادبی دنیا سے منسلک رہے البتہ اس محفل کو ہمیشہ یاد کیا۔ علی گڑھ، سیتاپور، شاہ جہاں پور اور بھوپال کے دورانِ قیام اُن کے فن میں پختگی آتی گئی۔ چھ افسانوی مجموعوں کے علاوہ دو ناولٹ بہ عنوان ''کسی دن'' 1997 اور ''نمک'' 1999 اشاعت سے ہم کنار ہوچکے ہیں۔

آصف فرخی نے شہرزاد، کراچی سے جب ان کے افسانوں کا انتخاب شائع کیا تو اُس میں ابتدائی چار مجموعوں کے منتخب افسانوں کے علاوہ چند نئے افسانے بھی شامل تھے جو بعد میں 'آگ کے پاس بیٹھی عورت' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے بعد اردو داں طبقے کو یہ احساس ہوچلا کہ اقبال مجید اب زیادہ دنوں تک افسانے نہیں لکھ سکیں گے لیکن جب تازہ افسانوں کا انتخاب 'خاموش مکالمہ' کے عنوان سے آیا اور قارئین نے محسوس کیا کہ اب بھی ان کے قلم میں تازہ کاری ہے تو لوگوں نے اس مجموعے کو شوق سے پڑھا۔ اس مجموعے کو پڑھ کر ایسا نہیں محسوس ہوتا کہ عدو چچا، دو بھیگے ہوئے لوگ، پیٹ کا کیچوا، پوشاک، قصۂ رنگ شکستہ کے خالق ایسے لازوال افسانے بھی لکھ سکتا ہے۔

خاموش مکالمہ، اقبال مجید کے افسانوں کا چھٹا مجموعہ ہے جو 2017ء میں کتاب دار، ممبئی سے شائع ہوا۔ اس مجموعے سے کل بارہ افسانے ہیں جو تین حصوں میں منقسم ہیں۔ تینوں حصوں میں چار چار افسانے ہیں۔ افسانے کا پہلا باب شمس الرحمٰن فاروقی کی نذر ہے، دوسرا مہدی جعفر کی نذر اور تیسرا علی احمد فاطمی کی نذر ہے۔ آخری مجموعے کا پہلا افسانہ ''خاموش مکالمہ'' ہے جو عالمی منظرنامے کو پیش کرتا ہے جس کا ابتدائی جملہ کچھ اس طرح سے ہوتا ہے: ''آمرانہ بدبختی کی جانب رینگتے ہوئے بدطینت اور بدصورت بچھ کھوپڑ جو زمین کے اندر رہتے ہیں اور بہت سخت جان ہوتے ہیں کیونکہ وہ تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں اس لیے جو جی چاہتا ہے اور جب تک جی

لین نمبر 3، ستار کالونی، باریتو، رانچی۔ 834009 (جھارکھنڈ)
فون: 9897858093 nashtar3116@gmail.com

چاہتا ہے کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ان کے ظلم سے زمین کہاں اور کتنی لال ہوئی''۔

اس افسانے میں راوی ٹی وی اسکرین پر نظر جمائے چند لوگوں کے بحث مباحثے کو باریکی سے سن رہا ہے جس میں ایک اسپیکر دنیا میں مسلمانوں کو بدنام کیے جانے کی بات کر رہا تھا اور وہ کہہ رہا تھا جس نے جرمنی میں یہودی کو مارے، کیا وہ مسلمان تھا یا جس نے عراق اور افغانستان میں جتنے بے قصوروں کو مارا گرایا، کیا وہ مسلمان تھا۔ تو دوسرا اسپیکر نفی میں سر تو ہلا دیتا ہے لیکن دل کے گوشے میں کہیں نہ کہیں یہ بات ضرور ہے کہ ان تمام مظالم کے ذمے دار مسلمان ہی ہیں جنھوں نے دنیا بھر میں دہشت گردی مچا رکھی ہے۔ ان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی گئی ہے کہ مسلمان ہی ایسی قوم ہے جو کچھ بھی کر سکتی ہے۔ ٹی وی کے اسکرین پر تیسرا آدمی اس طرح گویا ہوتا ہے: ''میں کہتا ہوں بم رکھے جا رہے ہیں، دھماکے ہو رہے ہیں، جانیں جا رہی ہیں، گرفتاریاں بھی ہو رہی ہیں لیکن ہم کو غصہ نہیں آنا چاہیے۔ غصے اور بم میں یہی فرق ہے کہ بم ایک دم سے پھوٹتا ہے، ذرا دیر کو لیکن غصہ پنپتا رہتا ہے۔ اندر ہی اندر پنپتا رہتا ہے پھلتا رہتا ہے۔''

راوی تمام باتیں سن کر ایک ہی فیصلہ کر پاتا ہے کہ یہ کچھ جو ہو رہا ہے وہ پیسے کی وجہ سے ہو رہا ہے پیسہ آج خدا کا درجہ رکھتا ہے، تھوڑے سے پیسے کے لیے آج آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ پیسہ کے لیے ہم عورتیں بیچتے ہیں، بیٹیاں بیچتے ہیں، اپنے دل گردے، آنکھیں اور ضمیر کیا کچھ نہیں بیچتے۔

افسانہ ''سوئیاں اور شر'' تصوف کے موضوع پر لکھا گیا ایک عمدہ افسانہ ہے جس میں شیخ صلاح الدین کے کردار کو موضوع بنا کر تصوف کے نکات کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ضمنی کرداروں میں گل شاہ، سلیمہ خاتون اور پیر و مرشد آتے ہیں۔ پورے خانقاہ میں اس وقت کھلبلی مچتی ہے جب سلیمہ نام کی خاتون کا ایک خط شیخ کے نام آتا ہے۔ لوگوں میں افراتفری پھیل جاتی ہے کہ آخر کیا ماجرا ہے تو گل شاہ اس کام پر معمور کیا جاتا ہے۔ جب کہ شیخ اپنے بارے میں جانتا تھا کہ وہ علم معرفت، علم باطل اور سلوک کی تعلیم حاصل کرنے پندرہ سال قبل خانقاہ میں داخل ہوا تھا کیوں کہ اس کے باپ کی تمنا تھی کہ بیٹے کی زندگی روحانی برکتوں سے لبریز اور سینہ عشق کی آگ سے روشن ہو جائے لیکن آستانے کے وعظ اور پند و نصائح کی تعلیم میں شیخ صلاح الدین کا جی نہ لگا۔ خانقاہ کی ساری ڈاک نائب سکریٹری کے پاس آتی تھی اور ساری ڈاک میں شیخ صلاح الدین کا لفافہ سب سے الگ ہوتا تھا کیوں کہ اسے بھیجنے والی اعلانیہ طور پر عورت ہوتی تھی۔ شیخ کی دو اولاد تھی اور بیوی زچگی میں ہی داغ مفارقت دے چکی تھی۔ گل شاہ کی تحقیق کے مطابق وہ خط سلمہ ہی لکھتی تھی جس کا شوہر کسی موقع پر قتل کر دیا گیا تھا۔ وہ شیخ میں دلچسپی لینے لگی تھی کیوں اُسے معلوم تھا کہ دونوں کی ضرورت ایسے کی ہے جو ایک دوسرے کا خیال رکھیں۔ اب خانقاہ کے لوگ شیخ پر نگاہ رکھنے لگے تھے۔ کچھ لوگوں نے شیخ کو شام کے وقت ایک مینار والی مسجد کی گلی سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ شیخ سے پرخاش رکھنے والوں نے ایک گواہ بھی پیش کر دیا کہ صلاح الدین ہومیوپیتھی کی ایک ڈاکٹرنی کے پاس جاتے رہتے ہیں اور اس بیوہ عورت سے مطب خالی ہو جانے پر بڑی لگاوٹ سے باتیں کرتے ہیں۔ خانقاہ کے پیر و مرشد ایک دن شیخ کو بلا کر بتاتے ہیں کہ ایسی حرکت سے باز آ جائے تو شیخ خانقاہ چھوڑ کر سلیمہ کے مکان میں منتقل ہو جاتا ہے اور دن میں اسکول کے دفتر کا کام کرتا ہے اور شام کو مہراٹا کیز میں گیٹ کیپری کرتا ہے۔ نکاح کے بعد سلمہ کہتی ہے کہ وہ اب جس خانقاہ میں رہ رہا ہے وہ مرد عورت اور بچوں کے لیے ہے اور اس کے کچھ آداب و اصول ہیں۔ مرحوم شوہر کی لائی ہوئی جینس اور ٹاپ نکال کر پہنتی ہے، پارلر جاتی ہے اور نئے شوہر کے سامنے کھڑے ہو کر ہنسنے لگتی ہے جسے دیکھ کر شیخ کے ہوش اڑ جاتے ہیں کہ ہونٹ پر لپ اسٹک ہے اور سر کے بال تراشے ہوئے ہیں تو اس کے باطن سے آواز آتی ہے کہ کلائی پر شیر بنوانے سے اس کے اندر اتنی ہمت پیدا ہو سکے گی کہ وہ بیوی کو ایسی حرکت کرنے سے منع کر سکے جو اُسے پسند نہ ہوں لیکن اپنے بچوں کی تربیت کے لیے وہ کچھ نہیں بول پاتا۔

افسانہ ''حنوط کی ہوئی تلوار'' آج کے سیاسی منظر نامے کو تلخ حقائق کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ واقعے کی شروعات ایک تاریخ کے طالب علم کو گھر کی کھدائی کرتے ہوئے مکان سے زنگ آلود تلوار کی صورت میں ملی تھی۔ وہ اسے ایک عام سی تلوار لگی تو وہ گہری نیند میں اسی تلوار کے متعلق ایک خواب دیکھا کہ شیر شاہ سوری گھوڑے پر سوار ہیں اور وہ یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ان کے سرہانے جو تلوار رکھی ہے، وہ اسی کی ہے۔ تو طالب علم کہتا ہے کہ کاش تم خواب کے بجائے حقیقت میں آ جاؤ تو ایک دن کے اندر تمہیں مع گھوڑے کے حنوط کر کے کسی میوزیم میں ڈال دیا جائے گا۔ طالب علم ایم فل کر رہا تھا تو اس نے مناسب سمجھا کہ اپنے پروفیسر یعنی پاس سے اس کا ذکر کیا جائے تو پروفیسر نے وہ تلوار کسی بھی صورت میں یہ کہہ کر حاصل کر لی کہ ذرا میں بھی لوگوں سے تحقیق کرا لوں کہ واقعی یہ شیر شاہ سوری کی تلوار ہے بھی یا نہیں ___ پروفیسر کو تلوار کی عظمت کا اندازہ تو ہو گیا اسی لیے اس کی نیت بھی بدل گئی۔ طالب علم مصروفیت کی وجہ سے یہ بھول گیا کہ تلوار کا معاملہ کیا ہے جب کہ پروفیسر شاطر ذہن کا مالک تھا وہ تگ و دو میں لگا رہا۔ اپنے دوست کا منا نائر سے اس نے اس بات کا ذکر ایک ایسے ہال میں کیا جہاں ایک مقرر یہ کہہ رہے تھے کہ ''ہمارا آئین شروع سے ہی ہندو دشمن رہی ہے'' تو دونوں لکچر سننے کے بجائے کافی شاپ میں آ گئے۔ اسی دوران پیے میں پروفیسر وانی کے حوالے سے ایک خبر چھپی جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ پروفیسر کو حنوط کی ہوئی تلوار دستیاب ہوئی ہے جس کا تعلق مغلوں کے عہد سے مانا جا رہا ہے۔ تلوار پر سوری حکمرانوں کے پرچم کا نشان بھی صاف بنا ہوا ہے۔ یہ سن کر طالب علم اور کامنا سکتے میں آ گئے کہ حنوط تو مردہ کو کہا جاتا ہے، تلواروں کو کب سے حنوط کہا جانے لگا۔ اس کے بعد واقعے کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جانے لگا کہ یہ تلوار مہارانا پرتاپ کی ہے۔ وہ اس علاقے سے گزر رہے تھے ممکن ہے لٹیروں نے گھیر لیا ہو اور اس حملے میں مہارانا نے اس کے سردار کو مغلوب کر کے ہتھیار ڈلوا دیے ہوں اور وہ سردار سوری خاندان کا رہا ہو۔ طالب علم کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کیوں کہ اس نے تاریخ کے صفحات میں کئی ایسے واقعات دیکھے تھے جنھیں توڑ مروڑ کر پیش کیا جا رہا تھا۔ کسی موقع پر معلوم ہوا کہ احمد آباد کے کسی امیر نے ڈیڑھ کروڑ میں اس تلوار کو خرید لیا ہے۔ اب طالب علم کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ پولیس کے پیچھے پڑی ہے کہ وہ تلوار اس نے کیسے اور کہاں سے حاصل کیا وغیرہ وغیرہ۔ رات کی تاریکی میں یہ خوف اور زیادہ بڑھ جاتا جب وہ اکیلا ہوتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ پولیس اس کے دروازے پر گشت کر رہی ہے۔ رات میں جب اس نے کامنا کو فون کیا تو اس نے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ تم کیوں پریشان ہو۔ تمہارا پروفیسر تمھیں دبّو سمجھتا ہے۔ زندگی کو اپنا دوست بنا کر اور اس کے دوست بن کر چلو۔ تم جس پروفیسر کی بات کر رہے ہو میں اس کے ساتھ سو چکی ہوں۔

افسانہ ''اپنے اپنے توتے'' میں بیان کی گئی کہانی دو مفلس اور نادار عورتوں سے شروع ہوتی ہے اور بعد میں ایسی شکل اختیار کر جاتی ہے کہ دونوں اس سوچ سے بھی ڈر جاتے ہیں۔ اسمٰعیل کھٹک کی ڈیوڑھی میں مالک مکان نے دو عورتوں کو اس لیے پناہ دی تھی کہ وہ دونوں وقت پر کام آ سکیں۔ ایک عورت کا نام گلابو تھا تو دوسری کا نام شتابو۔ گلابو کے پاس ایک توتا تھا اور شتابو کے پاس مینا۔ گلابو کی دوست جمالو تھی جس نے ایک مشورہ دیا کہ کیوں نہ توتے کو کچھ سکھا کر اُس سے پیسے حاصل کیے جائیں۔ گلابو کو یہ بات پسند آئی اور اس نے توتے کو پڑھا لکھا کر طوطا بابا آشرم کھول دیا اور اس سے ڈھیر سارے پیسے حاصل ہونے لگے۔ یہ دیکھ کر شتابو کو تکلیف ہوئی کہ وہ کیوں نہ امیر ہوئی۔ اس نے اسمٰعیل خٹک کی بیٹی سے اپنا دکھڑا بیان کیا اور ساتھ میں اس کا ہونے والا شوہر بھی تھا جس کا نام اقتدار عالم تھا۔ شتابو نے کہنا شروع کیا۔ ''میری قسمت میں رونا ہی لکھا ہے ورنہ میرے پاس بھی ایک مینا ہے۔ پڑ پڑ بولتی ہے، ایک گلابو کا توتا ہے کیا قسمت لے کر آیا ہے۔ یہ سن کر دونوں نے بھی یہی ترکیب شتابو کو بتائی کہ وہ بھی مینا کو سکھا کر تعلیم یافتہ بنائے اور لوگوں نے دونوں بوڑھیوں کا استعمال کرنا شروع کیا۔ کمائی دوسروں کے ہاتھ لگ رہی تھی بلکہ ان

پرندوں کے لیے ایسے ماہرین تلاش کر لیے گئے جو توتوں میں روحانی خصوصیات ابھارنے کا دعویٰ کرتے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں خبر آئی کہ توتا اور مینا موسیقی کے بعض ٹکڑوں پہ حال اور قال کی کیفیت میں ہونے لگے تھے۔

افسانہ ''مچھلی رے مچھلی'' خوف ودہشت کا المیہ ہے اور نئی صدی میں اس نے سماج میں کچھ زیادہ ہی جڑیں پھیلا رکھی ہیں۔ اس افسانے میں راوی یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ شہر میں کچھ شر پسند عناصر ایسے ہیں جن کے پاس کوئی کام نہیں ہے، ان کے حلیے ایک سے ہیں اور اُن کے لباس بھی ایک ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ان کی شکل جنگلی سور سے مشابہت رکھتی ہے تو کوئی انھیں جنگلی کتے کے مشابہ قرار دیتا ہے۔ انتظامیہ بھی انھیں گرفتار کرنے سے قاصر ہے اور لوگوں کی یہ امیدیں بندھی ہے کہ انتظامیہ کے پاس کوئی خبر آئے گی اور لوگ تھانے جا کر واویلا کریں گے۔ پہلے ان کا مقصد تھا کہ حسین لڑکیوں پر تیزاب پھینکتے اور ان کے چہرے خراب کرتے۔ چوں کہ وہ بائک پر سوار ہو کر حملے کیا کرتے اسی لیے عوام نے سرکار سے تجویز رکھی کہ چھوٹی بیل گاڑی، موٹر سائیکل کی جگہ چلائی جائے۔ اس سانحے سے سابقہ ایک سال میں شہر کی دوسو بیالیس لڑکیوں نے چھت کے پنکھے سے لٹک کر جان دے دی تھی اور موہنی کے مرنے کی خبر عام ہو چکی تھی۔ سختی زیادہ بڑھی تو تیزاب کو کین سے زیادہ مہنگا ہو گیا اور ذرا سا شک ہو جانے پر پولیس کے چھاپے پڑنے لگے۔ تیزاب کی مقبولیت کم ہوئی تو ریپ کے ویڈیوز عام ہونے لگے۔

مجموعہ کا سادہ افسانہ ''اوزاروں کا بکس'' ایک مولوی صاحب کی حرکتوں کے اردگرد گھومتا ہے جو پانچ سال محلوں کی چلمیں بھرتے، مصلے بچھاتے، وضو کے بدھنے بھرتے اور غربت کے دنوں میں ایک خرّانٹ مفتی کی گھڑکیاں سہتے اس مقام پر پہنچا تھا۔ اس کے بعد اس نے شیدا میاں سے تعلقات استوار کیے جو اپنے گھر مشاعرے کرواتا تھا۔ اسی شیدا نے اپنے بیٹے سلامت میاں کو پڑھانے لکھانے اور تربیت دینے کی ذمے داری اسی کو سونپ دی۔ شیدا ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ ان کا لڑکا دینی تعلیم حاصل کرے لیکن اسے بس یہ فکر لاحق تھی کہ خدانخواستہ اگر وہ علم حاصل نہ کر سکا تو اس کی عزت کیسے کرے گا۔ وہ دراصل اپنی حفاظت کے لیے اپنے لڑکے کو اللہ والا بنوا رہے تھے۔ یہ تشویش اسے اس وقت ہوئی تھی جب پتا چلا کہ بچن بیگ کے جاہل بیٹوں نے کاروبار کے چکر میں باپ کو گولی مار دی۔ بیٹے کو تعلیم یافتہ بنانے کے بعد شیدا کو مکمل یقین ہو گیا کہ وہ معتبر آدمی ہے تو بزنس کے تعلق سے بھی شہر کے باہر بھیجنے لگا۔ شہر جا کر سلامت نے صاف کہہ دیا کہ وہ شہر میں کہاں جاتا ہے، کس سے ملتا ہے، ان باتوں کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ زبیدہ نام کی لڑکی سے وہ ملتا ہے اور زبیدہ کا یہ خیال ہے کہ شادی سے پہلے اپنے باپ کی بزنس پر جلد از جلد قابو ہی نہیں پالے بلکہ اپنے ماں باپ سے بھی دست بردار ہو کر اپنی الگ اور آزاد زندگی گزارے جس میں زبیدہ کے علاوہ کسی کا دخل نہ ہو اس کے بعد ہی وہ سلامت سے نکاح کے لیے رضامند ہوگی۔ یوں بھی وہ نئے خیالات کی لڑکی تھی مولانا کو سخت ناپسند کرتی تھی اور اب مولانا کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ مولا گنج سے اُس کا دانا پانی اٹھ چکا ہے لیکن زبیدہ نے مولانا کو اسی جگہ پر ایک مدرسہ کھولنے کی دعوت دی۔ مولانا یہ سن کر خوش تو ہوئے لیکن شرمندگی سے اپنے آپ میں گڑ گئے کیوں کہ اُنہیں یہ احساس ہو چلا تھا کہ وہ کتنی تگڑم کر کے اس قصبے میں رہ رہے ہیں۔

افسانہ ''زہر پاش طیارے'' ہندو مسلم منافرت اور مسلمانوں کو ہندو سماج سے سمجھوتہ کرنا اور ایسے خاندان کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اپنے بچوں کو دینی تعلیم سے آراستہ نہیں کرتے۔ افسانہ نگار ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کرتا ہے جسے مولوی بشیر الدین کی ذات سے نفرت ہے جب کہ وہ اس کے بچے سلّو کو دینی تعلیم سے آراستہ کرتا ہے۔ پروفیسر کو لگتا ہے کہ مولوی بشیر الدین کو کسی بھی حال میں برطرف کیا جائے لیکن اس کے بچے اور بیوی کی عقیدت مندی کی وجہ سے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا پاتا ہے۔ اس کی بیوی مولوی کی گرویدہ ہے۔ ایک بار سخت آندھی کے موسم میں بھی وہ آدھمکتا ہے تو پروفیسر کو اس کی بیوی یہ دلیل دیتی ہے کہ یہ آدمی کسی بھی موسم میں تعلیم کے لیے اپنے گھر سے مدرسہ تک پہنچنے کے لیے ایک دریا اور تین گندے نالے مسلسل پار کرتا رہا ہے۔ ان نالوں سے اُسے جلد کی بیماریاں ہو گئیں۔ غریب آج بھی داد کھاج کا شکار ہے۔ مولوی کا کہنا ہے کہ مسلمان شریعت کو بھول گئے ہیں اسی لیے مسلمانوں کے پاس نہ عزت ہے نہ مال۔ پروفیسر کا خاندان ذہنی اعتبار سے دو حصے میں تقسیم ہے۔ ایک طرف پروفیسر اور اس کی تعلیم یافتہ بیٹی ہے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے کسی دوسرے شہر میں ہے تو دوسری طرف ماں بیٹا ہیں اور مولوی بشیر الدین ہیں جو ذہنی اعتبار سے دونوں کی تربیت اچھے ڈھنگ سے کر رہا ہے۔ پروفیسر کی بیٹی افشاں کی حالت یہ ہے کہ غیر مسلم محلے میں کوئی اسے مکان اس لیے دینے کو تیار نہیں ہے کہ وہ مسلمان ہے اور اس سے اوٹ پٹانگ سوال بھی کیے جاتے ہیں۔

افسانہ ''آہستہ آہستہ'' عورتوں کی مکاری اور حیلہ سازی کا افسانہ ہے۔ اس افسانے میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ عورت کے ہزار روپ ہوتے ہیں۔ انھیں سمجھ پانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا ہے۔ مرد سمجھتا ہے کہ عورت اس کی وفادار ہے لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ایک شخص کی بیوی بہ ظاہر پاک باز ہے لیکن اصل میں اس کے کسی مرد سے مراسم ہیں وہ شخص جب ڈیوٹی سے گھر آتا ہے تو بیڑی کے ٹکڑے نظر آتے ہیں وہ مرد سہم سا جاتا ہے وہ اس بات کا ذکر اپنی بیوی سے کرتا ہے تو وہ گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ بہت منانے کے بعد گھر واپس آتی ہے تو جواز یہ پیش کرتی ہے کہ میں سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں لیکن بیڑی پینا نہیں چھوڑ سکتی۔

افسانہ ''کتابوں پر موتنے والی'' ایک ایسی شاعرہ کی کہانی ہے جو اپنے حسن اور اداؤں کی وجہ سے مشاعرے میں شامل ہوتی ہے اور اس کے باپ کے دوست عبداللہ ملک کے قریب ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ طبیعت مچل جانے والے عشق و عاشقی والے شعر بھی سنایا کرتی تھی۔ اس کے پاس ایک کتیا بھی ہے جسے وہ اولاد کی طرح گود میں لیے پیار سے اس کا سر سہلا رہی تھی۔ اس کا نام جولی ہے۔ کبھی کبھی عبداللہ ملک کو دونوں میں کافی گہری مماثلت نظر آتی ہے۔ زلیخا کی نظر میں یونی ورسٹی کے پروفیسروں نے اکیڈمیوں کی انعامی کمیٹیوں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے، وہ مشاعروں کو ذلیل اور مشاعرہ پڑھنے والے مقبول ترین شعرا کو ذلیل تر سمجھتے ہیں اور اس صدی کو فکشن صدی کہتے ہیں ___ ان ہی دنوں زلیخا نے بتایا کہ عبداللہ ملک کو ریاستی حکومتوں نے 5 لاکھ روپے انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ زلیخا کا کہنا ہے کہ آپ کی تنگ دستی اور بڑھاپے پر چند مہربان دوستوں نے منظر واضح ہو جاتا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں سے بھرا ہوا سجا سنوارا ہال بار بار اس کی نظروں میں گھومنے لگا۔ تب رات کو نفس امارہ سامنے آتا ہے اور سوال کرتا ہے کہ ''کیا تم کو یہ بات اچھی لگے گی کہ تم اعزاز کے مستحق تو ہو لیکن وہ تم کو نہ ملے یا پھر یہ بات اچھی لگے گی کہ اعزاز تو تم کو مل جائے لیکن تم اس کے مستحق نہ ہو''۔ تو وہ نفس امارہ سے کہتا ہے کہ میں کسی بھی حال میں یہ رقم اور اعزاز واپس نہیں کروں گا۔ اس افسانے کے ذریعے اقبال مجید نے ایوارڈ حاصل کرنے والے قلمکاروں کا حال علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔

مندرجہ بالا افسانوں کے موضوعات پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے ایسا محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ان کے افسانوں میں تکرار کی صورت پیدا ہوئی ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اُن کی زیادہ تر تحریریں 'نیا ورق' میں شائع ہوئی ہیں۔ خودنوشت کے حوالے سے بھی ان کے طویل یادداشت اسی رسالے کی زینت بنتے رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اقبال مجید پر از سرنو کام کیا جائے جس میں ان کے اسلوب اور زبان و بیان پر خاص توجہ دی جائے۔ یہی اُن کے لیے سب سے بہتر خراج عقیدت ہے۔

☆☆☆

قمر جمالی

وہ تیرہ قدم

''**16** اکتوبر 1946ء''

اس نے پھٹ سے ڈائری بند کردی۔

جب بھی ڈائری کے اس صفحے پر اس کی نظر پڑتی، اس کا جسم پسینے سے شرابور ہوجاتا۔ ایک طرف تو وہ خوش تھا کہ حکومت نے اس یادگار شام کے لیے اس کا انتخاب کیا تھا۔

مگر.....دوسری طرف۔

خوف کی ایک جھرجھری سے اس کا سارا بدن کپکپا جاتا۔

کیا میں دیکھ سکوں گا وہ منظر.....؟!

پھانسی.....!

اف خداوندا.....!!

کاش! ان 186 باغی سپاہیوں کی طرح ان گیارہ سپاہیوں کو بھی معاف کردیا گیا ہوتا جو ہٹلر کے دست راست تھے۔

کاش ایسا ہوتا اور اسے اس منحوس دن کی رپورٹنگ نہ کرنی پڑتی۔

''نیویارک ٹائمز'' کا نامہ نگار وکٹر تمن پچھلے آٹھ دس دن سے اسی الجھن میں گرفتار تھا اور اپنی قسمت کو کوس رہا تھا اور اس دن کو بھی جب اسے حکومت کی جانب سے بہترین نامہ نگار کا قومی ایوارڈ ملا تھا۔ نہ اسے وہ ایوارڈ ملتا.....اور نہ ہی وہ حکومت کی نظر میں آتا۔

اس نے ڈائری پر ایک وزنی پیپر ویٹ رکھ دیا تاکہ ڈائری کھل کر پھر وہی پنّا اس کی نظروں کے سامنے پھیل نہ جائے۔

مگر.....جوں ہی وہ پلٹا.....

ہوا کا ایک تیز جھونکا چلا اور پیپر ویٹ لڑھک کر دور جا گرا اور ڈائری کا وہی پنّا اس کی نظروں کے آگے پھیل گیا۔

وہ گھبرا گیا اور ڈائری کو بند کرنے کے لیے آگے بڑھا کہ بجلی منقطع ہوگئی اور کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ وہ آنکھیں مل مل کر میز کے اس حصے کو گھورنے لگا، جہاں وہ ڈائری رکھی تھی۔

یکا یک.....کھڑکی سے روشنی کا ایک جھماکہ لپکا۔

اور.....اس نے دیکھا.....

کوئی اس کے روبرو کھڑا تھا۔ کھڑکی سے آتی روشنی کے بالمقابل۔

''تمہاری یہ نیک خواہشات کس کے لیے ہیں؟

ہٹلر کے ان درندوں کے لیے جنہوں نے پچھلے چھ سالوں میں پورے کرۂ ارض کو جنگ میں جھونک دیا۔ جنہوں نے ہٹلر جیسے خونخوار درندے کا پل پل ساتھ دیا۔ جنہوں نے بنی نوع انسان کو زندگی سے متنفر کردیا۔ ان گیارہ درندوں میں ہٹلر کے مشیر خاص اور جرنلس شامل ہیں جنہوں نے ستمبر 1939 سے اگست 1945 تک خون کی ہولی کھیلی۔

اگر روس، برطانیہ اور امریکہ کی اتحادی فوجیں مدد کے لیے آگے نہ بڑھتیں، تو.....

اس کرۂ ارض پر کوئی نہ بچتا۔

کاش.....! ہٹلر نے خودکشی نہ کی ہوتی.....!!

''تو کیا ہوتا.....؟'' وکٹر تامن متجسس ہوگیا۔

''تم.....اس کی سزائے موت کے بھی شاہد ہوتے۔''

اور مجھے اس سزا کی بھی رپورٹنگ کرنی ہوتی.....''

نہیں.....''

وکٹر اس زور سے چلایا کہ برابر والے کمرے میں سو رہے اس کے دوست جاگ پڑے۔

''کیا ہوا وکٹر.....؟''

''کچھ نہیں.....کچھ نہیں۔''

وہ خود سے شرمندہ تھا۔

وہ اتنا کمزور دل نہیں تھا۔ وہ ایک انوسٹی گیٹنگ رپورٹر تھا۔ خطروں کا سامنا کرنا اس کے روزمرہ میں شامل تھا۔

پھر اکیلے ہی اسے وہ منظر دیکھنا تھوڑے ہی تھا۔ اس کے ساتھ روس، برطانیہ، فرانس اور امریکہ کے آٹھ اور نامہ نگار بھی شامل تھے جنہیں اس منظر کی رپورٹنگ کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔

جنہیں ان گیارہ جرمنوں کو پھانسی پر چڑھتا ہوا دیکھنا اور عوام کو دکھانا تھا۔

کسی کو مرتا ہوا دیکھنا..... یہ کسی بھی نامہ نگار کے لیے کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔

پھر کیوں.....؟

یہ سوال وہ خود سے کئی بار کرچکا تھا۔ جواب یا تو اس کے پاس تھا ہی نہیں، یا اس نے ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی۔

16 اکتوبر 1946 کی شام:

تمام نامہ نگار وقت مقررہ پر نورمبرگ جیل پہنچ گئے تھے۔ جیل کے گورنر کرنل اینڈریو نے ان کا استقبال کیا۔

''آپ کو جہاں کھڑا کیا جائے، یا بٹھایا جائے آپ وہیں رہیں۔ ادھر ادھر جانے یا کسی سے بات کرنے کی سخت ممانعت ہے۔''

گورنر کرنل اینڈریو نے کہا اور انہیں ساتھ لے کر قیدیوں کو کوٹھریوں کی طرف چل پڑا جن میں گیارہ جرمن فوجی بند تھے۔ کوٹھریوں کے دروازوں پر لوہے کی سلاخیں تھیں اور ان پر لکڑی کے تختے چڑھے تھے۔ ہر دروازے پر ایک سپاہی پہرہ دے رہا تھا۔

کرنل اینڈریو نے تمام نامہ نگاروں کو ایک ایک کرکے ان کوٹھریوں کے دروازوں کی سوراخوں سے اندر

H.No 4-5، ہاگری نگر کالونی، گنڈ مگودا، حیدرآباد۔500091
تلنگانہ۔ فون:09985503977

جھانکنے کی اجازت دی۔

ہٹلر کا دست راست کوئرنگ کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔ باقی کچھ پڑھ رہے تھے یا لکھ رہے تھے۔ یا بے چین کوٹھری میں ٹہل رہے تھے۔ تمام نامہ نگاروں کو ساری جیل میں گھمایا گیا۔

رات ساڑھے نو بجے۔

'ٹن'۔

جیل کے گھنٹہ گھر کی گھڑیال کا گھنٹہ بجا۔

ساری بتیاں بجھا دی گئیں۔ اب صرف کوٹھریوں کے اندر کی بتیاں جل رہی تھیں۔

باہر وراندے میں اندھیرا ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد.....

انہیں ایک باغیچے میں پہنچا دیا گیا جہاں بتیاں جل رہی تھیں۔ اگرچہ جا بجا خوبصورت رنگ برنگے پھول کھلے تھے۔ پھر بھی.....اطراف میں نحوست کی عمل داری تھی۔

وکٹر تائمن نے نظریں گھما کر اطراف کا جائزہ لیا۔ باغیچے کے عین وسط میں ایک چبوترہ بنا تھا جس پر تین تختے رکھے تھے اور عین ان کے اوپر تین پھانسی کے پھندے لٹک رہے تھے۔ چبوترے پر چڑھنے کے لیے 13 سیڑھیاں بنی تھیں اور چبوترے سے لگے ایک کھمبے سے کالے نقاب لٹک رہے تھے۔

رات دس بجے۔

''آپ سب یہاں انتظار کیجئے۔ میں ان گیارہ قیدیوں کو یہ بتانے جا رہا ہوں کہ انہیں سزائے موت دی گئی ہے اور دو گھنٹے بعد انہیں پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا۔'' کرنل اینڈریو ان نامہ نگاروں کو وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ عجیب بات تھی۔ حالانکہ سزائے موت کا فیصلہ گزشتہ شام ہو گیا تھا۔ مگر قیدیوں کو فیصلے سے لاعلم رکھا گیا تھا۔ شاید یہ ان کی جنگی عدالت کی خفیہ پالیسی تھی۔

رات بارہ بجے۔

کرنل ایڈریو بھاگتا ہوا باغیچے کی طرف آیا۔

اس کے چہرے سے گھبراہٹ کے آثار ہویدا تھے۔ اس کی آواز لرز رہی تھی اور چہرہ پسینے سے تربتر تھا۔

''کوئرنگ مر گیا۔''

اس نے اپنی اکھڑی ہوئی سانسوں کو درست کرتے ہوئے کہا۔

''اس نے ٹریبونل میں رحم کی درخواست کی تھی۔ جب اسے بتایا گیا کہ اس کی درخواست رحم مسترد کر دی گئی ہے اور سزائے موت لازم کر دی گئی ہے، تو غصے میں اس نے مٹھیاں بھینچ لی اور تیزی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

کچھ دیر بعد..... اس نے چارپائی پر بیٹھ کر سر جھکا لیا۔''

اینڈریو کی سانس بری طرح پھول رہی تھی۔ وہ چپ ہو گیا۔

تمام نامہ نگار اس کے پاس چلے آئے تھے۔ ان کے قلم تیزی سے نوٹ پیڈس پر متحرک تھے۔

''ساڑھے دس بجے سنتری نے اندر سے کراہنے کی آواز سنی۔''

اینڈریو نے سنبھالا لے کر دوبارہ کہنا شروع کیا۔

''سنتری نے قفل کے سوراخ سے اندر جھانک کر دیکھا۔ کوئرنگ تڑپ رہا تھا۔ سنتری نے ڈیوٹی آفیسر کو اطلاع دی۔ افسر ڈاکٹر کو لے کر خود سیل میں پہنچے۔

مگر.....کوئرنگ مر چکا تھا۔

ڈاکٹروں کو اس کے منہ میں پسے ہوئے کانچ کے ریزے ملے۔ مگر..... معائنے کے بعد ثابت ہوا کہ اس نے پٹاشیم سائنائیڈ کھا کر خودکشی کی۔''

نامہ نگار اس روداد کو تیز تیز قلم بند کر رہے تھے۔

کوئرنگ جرمن فوج کا فیلڈ مارشل تھا۔ کرۂ ارض کو تباہ کاریوں کے دہانے تک لانے کا لائحہ عمل اسی کا تیار کیا ہوا تھا۔ انصاف کا تقاضا تو تھا کہ اسے عبرتناک موت ملے۔

مگر.....مرتے ہوئے بھی اس نے انتہائی چالاکی سے اپنی موت چنی۔

اس کے سرہانے کاغذ کی پرچی ملی جس پر کھلے کھلے لفظوں میں لکھا ہوا تھا۔

''تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جہاں فیلڈ مارشل کو کسی نے پھانسی پر چڑھایا ہو۔''

کرنل اینڈریو نے وہ پرچی نامہ نگاروں کو دکھائی۔

نامہ نگاروں نے دھڑا دھڑ اس پرچی کے عکس لیے۔

''دنیا کا سفاک ترین انسان!!''

وکٹر تائمن کے منہ سے نکل گیا۔

اس کی آنکھوں میں اس کا لومڑی جیسا چہرہ گھوم گیا۔ اس نے بین الاقوامی ٹریبونل میں اسے دیکھا تھا۔ اس نے اپنا مقدمہ خود لڑا تھا اور نہایت شدومد کے ساتھ چلا چلا کر اپنی مدافعت میں دلائل پیش کر رہا تھا۔ وہ جینا چاہتا تھا۔

بلکہ.....حکومت کرنا چاہتا تھا.....

''پیسہ خدا ہے۔''

یہ کوئرنگ کا نظریہ تھا۔ اس نے بے پناہ دولت جمع کی تھی۔ جنگ کی ابتدا میں جرمنی نے جتنے ملکوں پر قبضہ کیا وہاں کی بیشتر دولت کوئرنگ سمیٹ لایا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جرمن ساری دنیا پر فتح یاب ہوں گے اور وہ اس قوم پر ہی نہیں بلکہ ساری دنیا پہ بادشاہت کرے گا۔

کاش کہ وہ یہ دیکھتا کہ دنیا کی طاقتوں کے اوپر بھی ایک اور طاقت ہے جو کسی کو بادشاہ بنانے..... یا نہ بنانے کا جواز رکھتی ہے۔

معصوم انسانوں کا بے رحم قاتل جو خود کو بہادر سمجھتا تھا، اتنا بزدل نکلا کہ اپنے گناہوں کا خمیازہ بھگتنے سے پہلے ہی موت سے ہم آغوش ہو گیا۔ تف ہے تجھ پر کوئرنگ۔

وکٹر نے حقارت سے نیچے تھوک دیا۔

رات بارہ بج کر پچپن منٹ۔

تمام نامہ نگاروں کو چبوترے کے سامنے بٹھا دیا گیا۔

رات ایک بجے۔

ٹریبونل کے، ڈاکٹر، جرمن بولنے والے ترجمان، جیل کے افسران اور جلاد آ گئے۔ تمام حاضرین الگ کھڑے ہو گئے۔ اب ترجمان اور جلاد چبوترے پر چڑھ گئے۔

رات ایک بج کر گیارہ منٹ۔

ہٹلر کے مشیر ربن ٹراپ کو لایا گیا۔

پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس کے ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ اس کے ہاتھوں سے ہتھکڑیاں کھول کر انہیں پیچھے باندھ دیا گیا۔ ہر سیڑھی پر قدم رکھ کر وہ رکتا اور اپنی سانسیں درست کرتا۔

تیرہ سیڑھیاں چڑھنی تھیں اسے۔

اس کے چہرے کے کرب سے ہویدا تھا کہ ان تیرہ سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے وہ درحقیقت تیرہ بار مر چکا تھا۔

''تمہارا نام.....؟''

پھانسی کے تختے پر پہنچتے ہی انگریزی میں اس سے پوچھا گیا پھر جرمن ترجمان نے اسے جرمنی میں دہرایا۔

''جوآچم ربن ٹراپ۔''

اس نے جواب دیا۔

''کوئی آخری خواہش.....؟'' جرمن ترجمان نے

پوچھا۔

''میں..... عالمی امن کا خواہش مند ہوں۔ مشرق ومغرب میں مفاہمت ہونی چاہئے۔''

''مضحکہ خیز۔''

وکٹر تائمن کے منہ سے نکل گیا۔

''جس نے اپنی حکمت عملی سے اس وحشیانہ جنگ کا منصوبہ تیار کیا۔ جس نے غیر جرمن قوموں کو نیست ونابود کر دیا۔ جس نے معصوم بچوں کی فریادوں پر ترس نہ کھایا، اس کے منہ سے عالمی امن کی خواہش کا اظہار.....! !لعنت ہے اس پر۔''

تمام نامہ نگاروں نے وکٹر تائمن کے الفاظ ریکارڈ کر لیے اور اس کی تصویریں کھینچیں۔ ایک بج کر پندرہ منٹ۔

ربن ٹراپ کے پاؤں کے نیچے سے تختہ سرک گیا اور دنیا کو فتح کرنے کا خواب دیکھنے والا تاریخ انسانیت میں عبرتناک حقیقت کا حصہ بن گیا۔

ایک بج کر سترہ منٹ.....

جرمن فیلڈ مارشل کیتل کو تختۂ دار پر لایا گیا۔

وہ اپنے جذبات پر قابو رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ پھر بھی اس کے چہرے سے خوف عیاں تھا۔ اس نے چبوترے پر پہلا قدم رکھتے ہی رک کر اپنے اطراف موجود حاضرین پر ایک نظر ڈالی.....

ایک لمحہ رک کر اپنی سانسیں درست کیں۔

پھر..... بہ آواز بلند گویا ہوا۔

''میں..... ولیم کیتل..... خدا سے التجا کرتا ہوں کہ وہ جرمن قوم پر رحم کرے۔ بیس لاکھ سے زیادہ جرمن سپاہی اور افسران اپنے وطن پر مر مٹے۔ میں اب ان وطن پرستوں اور جاں نثاران قوم کے پاس جا رہا..... الوداع.....'' ولیم کیتل، ہٹلر کا ایک انتہائی چالاک اور زیرک مارشل تھا۔ اس کا قصور صرف جنگی مشورے دینا ہی نہیں تھا بلکہ اس کے شاطر دماغ نے بیس لاکھ سے زیادہ جرمن فوجیوں کو روس اور یوروپ کو فتح کروانے کے خواب دکھلا کر انہیں مروا دیا تھا۔ اگنت عورتیں اور بچے ولیم کیتل کے مشق ستم کا شکار ہو کر جرمنی کی گلیوں میں بے یارومددگار پھر رہے تھے۔ یہ وہی بے غیرت فوجی لیڈر تھا جسے برلن میں جرمنی کی شکست پر دستخط کرتے دیکھا گیا تھا۔ ایک بج کر سینتیس منٹ۔

ہٹلر کے دست راست کیلتن بروز کو جانبدار لایا گیا۔

اس کی شکل وصورت اور جثہ اژدہے کے مانند تھے۔ فراخ بھی سانپ جیسا ہی پایا تھا۔ یہ بے رحم قاتل جرمنی کا قابل ترین ڈاکٹر تھا۔ اس کی موٹی موٹی لمبی انگلیاں اب بھی بے چین سی تھرک رہی تھیں جیسے کسی کا گلا دبوچنے کے لیے بے چین ہوں۔ پیشے کے تقدس سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ جنگ کے دوران اس نے ایک سیکورٹی پولیس کا دستہ تیار کیا تھا جنہیں مقبوضہ علاقوں کے شہریوں کے قتل عام کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ اس نے بیگار کیمپوں میں پناہ گزینوں کے قتل کے لیے ایسے حربے اختراع کیے تھے کہ خدا کی پناہ! مگر آج۔

وہ ان تیرہ سیڑھیوں کو چڑھتے ہوئے اپنے ہی ایجاد کردہ حربوں کا شکار ہو گیا تھا۔

''میں بیمار ہوں..... اور بیمار کو پھانسی نہیں دی جاتی۔''

اس نے تختۂ دار پر چڑھنے سے پہلے حتی المقدور کوشش کی۔

مگر.....

ڈاکٹروں نے معائنے کے بعد سند دی کہ وہ بہانہ کر رہا تھا۔ اب وہ رحم طلب نظروں سے کبھی جلاد کی طرف اور کبھی وہاں موجود لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جلاد نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر کالا نقاب چڑھا دیا کہ اس کے اور امید کے بیچ رابطہ ٹوٹ جائے۔ اب اسے احساس ہوا کہ فریادیں جب نظر انداز کر دی جاتی ہیں تو.....

دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔!!

اب ایلفر ڈ روزنبرگ کی باری تھی۔

اس نے نسلی امتیاز کا نظریہ اختراع کیا تھا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ جرمن قوم دنیا کی سب سے اعلیٰ ترین قوم ہے اور اس کی موجودگی میں دوسری قوموں کو آزادانہ زندگی جینے کا حق نہیں ہے۔ اس فلسفے کو ہٹلر نے مان لیا تھا۔ دراصل یہی 'نظریۂ فوق النسل' جنگ کا سبب بنا تھا۔

''اپنا نام بتاؤ.....'' ترجمان نے پوچھا۔

نازیوں کو دنیا کا سب سے الگ فلسفہ دینے والا، سارے کرۂ ارض پر موت کا کھیل کھیلنے والا کھلاڑی اب بے آواز ہو گیا تھا۔ اس نے اتنی کمزور اور مردہ آواز میں اپنا نام بتایا کہ سوائے بازو میں کھڑے جلاد کے اور کسی نے اس کی آواز نہیں سنی۔

لمحہ بھر میں وقت نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔

رات کا ایک پہر گزر چکا تھا۔

سناٹا ایسا کہ سانسوں کے سرکنے..... اور نامہ نگاروں کے نوٹ پیڈز پر سرکتی ہوئی تحریروں کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ باغیچے میں جلتی خاموش بتیاں گونگے تماشائیوں کی طرح ٹمٹماتی دم بھر رہی تھیں۔ جس وقت ہینس فرینک کو تختۂ دار پر لے جایا گیا۔ رات کے ایک بج کر چھپن منٹ گزر چکے تھے۔ فرینک ہٹلر کا مشیر قانون تھا۔ بیگار کیمپ کا تصور اسی کا دیا ہوا تھا۔ یہ اسکیم اسی کی بنائی ہوئی تھی۔ بظاہر تو وہ بیگار کیمپس ہوتے مگر ہینس کی خفیہ پالیسی ایسی وحشت ناک تھی کہ عام انسان تو بیگار کیمپ کے نام ہی سے دم توڑ دیتے تھے۔

پولینڈ پر قبضے کے وقت ہینس پولینڈ کا گورنر جنرل تھا۔ پولینڈ کی فوج اور عام شہریوں نے پورے 17 دن تک جرمن فوج کا مقابلہ کیا تھا۔ آخر وہ ننھا سا ملک جرمن فوجی حربوں کے آگے ٹک نہ سکا۔ ہینس فرینک کو مقبوضہ پولینڈ کا گورنر بنا دیا گیا۔ ہینس مقبوضہ علاقے کے پولش شہریوں کو بیگار کیمپوں میں بھرتی کروا دیتا جہاں ان سے بھوکوں پیٹ غیر انسانی مشقت کرائی جاتی۔ عورتوں اور بچوں کو فاقہ کشی سے مارتا اور گلی کوچوں میں شہریوں کا قتل عام کرواتا۔

پھانسی کے تختے پر جب جلاد اس کے پاؤں باندھ رہا تھا اس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر لمحہ بھر میں اس کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ اس کے ہونٹ کپکپانے لگے تھے۔ جلاد نے بعد میں بتایا کہ وہ کہہ رہا تھا.....

''خداوند! مجھے اپنی پناہ میں لے لے۔''

اس کے بعد..... ولیم فرک کی باری تھی۔

ولیم فرک کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ یہ ہٹلر کا وزیر داخلہ تھا اور کروڑوں بے گناہ انسانوں کے قتل عام پر اپنے دستخط کر چکا تھا۔ اس نے نہ صرف غیر جرمنوں کی پھانسی کے پروانوں پر دستخط کیے تھے بلکہ اپنی قوم کے ایسے لوگوں کو زہر کے انجکشن لگوا کر مار رہا تھا جو بے کار تھے۔ یعنی ضعیف اور بچے جو سرکاری خزانے پر بار تھے۔ یہ سلسلہ جرمنی کی شکست تک چلتا رہا۔

ولیم فرک نے جب پہلی سیڑھی پر پاؤں رکھا..... اس کے قدم ڈگمگا گئے۔ سنتریوں نے اسے سہارا دے کر موت کی وادی کے تیرہ قدم پورے کروائے۔

''نام بتاؤ.....''

''ولیم فرک۔''

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

مگر.....

آواز کی کپکپاہٹ پیاسے ہونٹوں کے شگافوں میں پھنس کر رہ گئی اور موت کے سیاہ ہاتھوں نے زندگی دبوچ لی۔

اس کے بعد ایسا شخص مقتل کی طرف لایا گیا جس نے نازی جرمنوں کی ذہن سازی کی۔ یہ جیولس تھا۔ جیولس اسٹریچر۔ اس کی چال اور انداز میں خوف کی جگہ نفرت تھی۔ اس نے اپنی قوم کو ذہن نشیں کروادیا تھا کہ جرمن اشرف المخلوقات ہیں اور دنیا کی دوسری تمام قومیں کمزور اور قابل نفرت ہیں۔ اس نے جرمن فوجیوں کو ٹریننگ کے دوران یہ باور کروادیا تھا کہ غیر جرمن کو قتل کرنا جرم نہیں بلکہ کارِ ثواب ہے۔ تختۂ دار پر جب اس سے اس کا نام پوچھا گیا تو اس نے نفرت سے جواب دیا۔

''تمہیں میرا نام معلوم ہے۔''

جرمن ترجمان نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

''تمہیں معلوم ہے۔''

اس نے مزید نفرت سے جواب دیا۔ اور گلا پھاڑ کر نعرہ لگایا ''ہیل ہٹلر.....''

یعنی ہٹلر زندہ باد۔ اب ترجمان نے تیسری بار اس کا نام پوچھا۔

تیسری بار اس نے اپنا نام بتایا اور بلند آواز میں کہا..... ''اب میں خدا سے اپیل کرتا ہوں۔''

اس نے حقارت سے روسیوں کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

''روسیو! ایک دن تمہیں بالشویک پھانسی پر چڑھا دیں گے۔''

پھر وہ چلا چلا کر امریکیوں، انگریزوں اور روسیوں کو لعن طعن کرتا رہا۔ حتیٰ کہ کالے نقاب نے اس سے اس کی آواز چھین لی۔

اس کے بعد ساؤکل کی باری تھی۔ اس کے ذمہ مقبوضہ علاقے کے شہریوں کو پکڑ کر بیگار کیمپ میں بھرتی کروانا تھا جہاں ہزارہا انسان بھوک اور فاقہ کشی یا پھر دق اور سل کے امراض میں مبتلا ہوکر مرگئے۔ اس نے بڑی جواں مردی سے تیرہ منزلیں پار کیں اور بہ آواز بلند اپنا نام بتایا اور کہا.....

''یہ سزا بالکل ناجائز ہے۔ یہ ناانصافی ہے۔''

رات: آہستہ آہستہ سرک رہی تھی۔

اور

جرمنی کی ایک نئی تاریخ رقم ہورہی تھی۔

ظلم واستبداد کے خاتمے کی،

فوق النسل ہونے کے تکبر کے نیست ونابود ہونے کی۔ اور.....

جرمنی کی عبرتناک شکست کی۔

اب جو شخص سوئے مقتل لایا جارہا تھا اس کا نام تھا ایلفر ڈ جول۔

اس کی چال میں بڑی رعونت تھی۔ اس نے تقریباً دوڑتے ہوئے سیڑھیاں عبور کرلیں اور خود ہی تختۂ دار پر جا کھڑا ہوا اور بنا پوچھے ہی اپنا نام پکارا تھا۔

''ایلفر ڈ جول.....!!''

یہ وہ شخص تھا جس کے ذمہ ان لوگوں کی گرفتاری تفویض تھی جنہوں نے جرمنی کے خلاف زمین دوز جماعتیں بنائیں اور اندر ہی اندر جاسوسی کرکے زمین دوز بارودی سرنگیں بچھائیں۔ اس نے پولیس کا ایک دستہ تیار کیا تھا اور انہیں حکم دے رکھا تھا کہ مقبوضہ غلاموں میں اپنے ملک پر جاں نثار کرنے والے ایسے شہریوں کو جن پر ذرا سا بھی شک گزرے خواہ وہ کوئی معصوم بچہ ہی کیوں نہ ہو اسے جان سے مار دیں۔ اس نے مقبوضہ روس میں شہریوں کو مکھیوں کی طرح مروادیا تھا۔

جب.....

اس کے پاؤں باندھے جارہے تھے اس نے چلا کر کہا.....

''میرے جرمن ساتھیو! میں تمہیں سلام کرتا ہوں۔''

سب سے آخر میں

ڈاکٹر آرتھر سیس انکارٹ کو لایا گیا۔

اس شخص کے چہرے پر عالموں کا سا وقار تھا۔ مگر..... وہ ہٹلر کا جلاد تھا۔ اس نے پولینڈ میں قتل عام کا منصوبہ بنایا اور اس کو عملی جامہ پہنایا تھا۔

رات دو بج کر چھیالیس منٹ اور تیس سیکنڈ۔

جرمن کے درندہ صفت، ہٹلر آمیز دستے کے تمام کردار اپنے کیفر وکردار کو پہنچ چکے تھے۔ کوئرنگ پہلے ہی مرچکا تھا۔ سنتری اس کی لاش بھی اٹھا لائے اور ان مصلوب شدہ لاشوں کے پہلو میں لٹا دیا تھا۔

اس طرح..... دوسری جنگ عظیم کے اس ہولناک المیے کا خاتمہ ہوگیا تھا جسے انسانی تاریخ درندگی کے لیے ہمیشہ یاد رکھے گی۔ وکٹر تائمن دوسرے اور نامہ نگاروں کے ساتھ باہر نکل آیا۔

رات جرمن درندگی کی ہولناک تاریکی کو جذب کرکے مزید تاریک ہوگئی تھی۔ اس کے باوجود وکٹر تائمن کو اپنے اطراف اجالا ہی اجالا دکھائی دے رہا تھا۔

اگرچہ وہ ایک تھکا دینے والے اعصابی دباؤ سے گزر چکا تھا۔ مگر.....

اسے اپنے اندر ایک انجانے سکون کا احساس ہورہا تھا۔

اسے تنفس کا عارضہ تھا اور اکثر ایسے اوقات میں اسے سانس لینے میں دشواری ہوجاتی تھی۔

مگر آج.....

اسے لگا کہ یکا یک اس کی سانس کی نالی میں اٹکی ساری کثافتیں آپ ہی آپ نکل گئیں اور سانسوں کی راہداری صاف ہوگئی تھی۔

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ شاہراہ کے لگتے ہی وہ ایک برج پر چڑھ آیا۔ یہ ایک فلائی اوور تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ ریلنگ کو پیٹھ لگا کر کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ ریلنگ کی دیوار پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

نیچے.....

دنیا جاگ اٹھی تھی۔

وہ دیکھ رہا تھا.....

صفائی عملہ بڑے زور وشور سے اپنے منصب پر ڈٹا ہوا تھا۔ یہاں وہاں سے انہوں نے بہت سی لاشوں کو اکٹھا کرکے ایک جگہ ذخیرہ کیا تھا۔

اب.....

لاشیں ٹرکوں میں بھری جارہی تھیں۔

ٹرکیں دندناتی ہوئی برج کے نیچے سے گزر رہی تھیں۔

وہ ریلنگ سے جھک کر نیچے دیکھ رہا تھا۔

''موسیو.....!''

کسی نے ٹھوکا دیا۔

وہ چونک اٹھا۔

''اتنی ساری لاشیں.....؟''

انگلی کے اشارے سے اس شخص نے دریافت کیا۔

''ہاں شہر کو تعفن سے پاک کیا جارہا ہے۔''

اس نے چونک کر اپنے اطراف دیکھا۔

وہاں کوئی نہ تھا۔

سحر کی سپیدی پھیل رہی تھی۔

نور کی بارش تھی۔

اور.....

فضا معطر تھی۔

اس نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالا..... اور چل پڑا۔

☆☆☆

رینو بہل

رشتوں کی کربلا

آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔ معمول کی طرح راہداری سے کبھی کبھی کسی کے قدموں کی آہٹ رات کی خاموشی میں خلل ڈال دیتی۔ سسکیوں کی آواز سن کر کانتی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ زیرو بلب کی ہلکی روشنی میں اس نے نیند سے بوجھل آنکھوں کو زور دے کر کھولا تو اس کی نظر آخری بستر پر اوندھے منہ لیٹی چمپا کلی پر جا ٹکی۔ ایک نظر اس نے درمیان والے بستر پر ڈالی۔ پھول متی گہری نیند سو رہی تھی۔ اپنے پھیلے جسم کو سمیٹ کر احتیاط سے اٹھی اور ننگے پاؤں ہی چمپا کلی کے بستر کے پاس پہنچ گئی۔

''چمپا اب بس بھی کر کتنا جی کو جلائے گی۔ صبح سے تیرا یہی حال ہے کیوں اپنی طبیعت خراب کر رہی ہے؟'' شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے چپ کرانا چاہا۔

چمپا کلی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اسی طرح روتی رہی۔

''خود کو سنبھال چمپا۔ اب تو تھوڑے دنوں کی بات رہ گئی ہے۔ یہ بھی دیکھتے دیکھتے گزر جائیں گے۔'' کانتی نے اس کا بازو اس کے چہرے سے ہٹا کر اپنی انگلیوں سے اس کے بھیگے رخسار خشک کیے۔

''دیکھ مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا ہے۔ یہ تینوں بھی پریشان ہو رہے ہیں۔ تو اس طرح روتی رہے گی تو میں سو نہیں پاؤں گی۔'' کانتی نے اپنے پیٹ کو سہلاتے ہوئے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ آپ سو جایئے اب نہیں روؤں گی۔'' اس نے پیار سے کانتی کا ہاتھ دباتے ہوئے اسے تسلی دی۔

کانتی کمر پر ہاتھ رکھے اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔

پھول متی گہری نیند سوئی رہی۔

پچھلے پانچ مہینے سے تینوں ایک ہی کمرے میں رہ رہی تھیں۔ نہ تو رشتہ دار ہیں نہ سہیلیاں۔ تینوں کی زندگیوں کے حالات الگ الگ، تینوں عمر کے الگ الگ پڑاؤ پر ہیں اور تینوں الگ الگ جگہ کی مکین۔ مگر تین باتیں مشترکہ ہیں۔ تینوں غربت کی ماری حالات سے مجبور۔ تینوں نے اپنے پریوار کے لیے مستقبل کے سنہرے خواب دیکھے ہیں اور تینوں نے اپنی کوکھ کرایہ پردے رکھی ہے۔ لہٰذا تینوں ایک ہی کشتی کی مسافر ہیں۔

ملک میں جب سے طبی سیاحت کی صنعت کو فروغ دینے کے اقدامات کیے جا رہے ہیں تب سے نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ملک کے باشندے بھی اس سے فیضیاب ہوئے ہیں اور جب سے سیروگیشن کو قانونی طور پر جائز قرار دیا گیا ہے اس تجارت میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔

کانتی کی عمر چالیس کو چھو رہی ہے۔ اس کے لیے یہ جگہ نئی نہیں۔ وہ دوسری بار یہاں آئی ہے۔ تین سال پہلے جب اس کے شوہر دیانند نے اس سے اس بارے میں بات کی تھی تو وہ حیرت سے اس کا منہ دیکھتی رہ گئی تھی پھر بپھر اٹھی تھی:

''کیسے مرد ہو پیسوں کے لیے مجھے کسی اور کے بچے کی ماں بننے کو کہہ رہے ہو؟ تمہارا ضمیر مر گیا ہے کیا؟''

''تجھے کون سا کسی کے ساتھ سونے کو کہہ رہا ہوں صرف کرایہ پر مطلب.....؟''

''مطلب تمہیں ڈاکٹر سمجھا دیں گے تو بس میرے ساتھ چلنا۔ مجھ پر بھروسہ ہے نا؟ کچھ غلط نہیں ہونے دوں گا تیرے ساتھ۔''

بھروسہ تو اسے خود سے زیادہ تھا اس پر یہ وہ جانتی تھی وہ جو کرے گا سب کے بھلے کے لیے ہی کرے گا۔

اسپتال پہنچ کر پتا چلا تھا کہ کوکھ کرایہ پر دینے کے لیے بہت سے امیدوار ہیں۔ اسپتال کیا تھا پانچ ستارہ ہوٹل لگ رہا تھا۔ ایک الگ ہال کمرے میں ان جیسے ہی بیس پچیس لوگ جمع تھے۔ پھر کمرے کی روشنی مدھم کر دی گئی اور ایک لیڈی ڈاکٹر نے اسکرین پر تصویریں دکھا کر سمجھانا شروع کیا۔

''آپ سب یہاں جس مقصد کے لیے آئے ہیں اس کے بارے میں بات کر لیں۔ ہم اپنی کوششوں سے لوگوں کی زندگیوں کی محرومیوں کو دور کرنے کا جتن کرتے ہیں۔ جن کے یہاں اولاد نہیں ہوتی اور وہ بچہ گود بھی نہیں لینا چاہتے، ہم ان کے خواب پورے کرتے ہیں، انہیں ان کی اولاد دے کر اور ان لوگوں کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں جو اولاد کی دولت سے مالا مال ہیں مگر انہیں زندگی کی ضروریات مہیا نہیں کرا سکتے۔

اب میں آپ کو بتا دوں کہ یہ ہم کیسے کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم اس عورت کی بیضہ دانی کو ہارمون کے انجیکشن دے کر ترغیب دے کر انڈے تیار کرتے ہیں جو اولاد کی خواہش میں ہمارے پاس آتی ہیں۔ جب انڈے تیار ہو جاتے ہیں تو اس کے شوہر کے نطفہ سے زرخیز بنایا جاتا ہے اور اگر ٹیسٹ کی رپورٹ ٹھیک آ جائے تو کرایہ کی کوکھ میں اسے نصب کر دیتے ہیں۔ حاملہ عورت کی صحت کی پوری ذمہ داری ہماری رہتی ہے۔ وقت وقت پر ٹیسٹ ہوتے ہیں، جانچ ہوتی ہے اور بچہ پیدا ہوتے ہی اسے اس کے اصل والدین کو سونپ دیتے ہیں۔

اس کے لیے کچھ باتیں بہت ضروری ہیں۔ کرایہ پر کوکھ لینے سے پہلے عورت کے مختلف ٹیسٹ ہوتے ہیں۔ اگر سب ہمارے معیار پر پورے اترے تو ہی کرایہ پر کوکھ لی جاتی ہے۔

کرایہ پر کوکھ لیتے ہی کچھ ضروری کاغذات دستخط کروائے جاتے ہیں تاکہ کل کو کوئی دقت نہ ہو۔ کرایہ کی پہلی قسط اسی وقت دی جاتی ہے اور زچگی کے بعد پوری رقم ادا کر دی جاتی ہے۔ جو حاملہ عورتیں نزدیک رہتی ہیں وہ اپنے گھر رہ سکتی ہیں بشرطیکہ اپنی صحت کا خیال رکھے اور مقررہ وقت پر چیک اپ کے لیے آتی رہے اور جو دور دراز سے آتی ہیں انہیں ہم اپنے اسپتال میں رکھتے ہیں۔ ان سے ملنے ان کے گھر کے لوگ اتوار کے اتوار آ سکتے ہیں۔ صبح دس سے شام پانچ بجے تک۔

اور اب آپ کو بتا دوں کہ کرایہ کتنا ہوگا۔ تو سن لیجئے کہ اتنا مل جائے گا جتنا یہ عورتیں ساری عمر نہیں کما سکتیں۔ ہال میں

1505، سیکٹر B-49، چنڈی گڑھ۔ 160047
فون: 09781557700

کھسر پھسر شروع ہوگئی۔

دو منٹ خاموش رہ کر ڈاکٹر نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''پانچ لاکھ ایک بچے کا اور اگر جڑواں ہوئے تو سات لاکھ۔ میرا خیال ہے میں نے سب واضح کر دیا۔ اب آپ سوچ سمجھ کر اپنی رضامندی دے سکتے ہیں۔ ہمارے پاس جیسے ہی کوئی ضرورت مند آئے گا ہم آپ سے رابطہ کر لیں گے۔''

ہال کی روشنی جل اٹھی اور ڈاکٹر اپنا سامان اٹھا کر باہر نکل گئی۔ وہاں موجود لوگوں نے اس کے اسسٹنٹ کو گھیر لیا۔

واپسی کے راستے پر دونوں خاموش اپنے اپنے خیالوں میں کھوئے رہے۔ اس رات دیر تک وہ سو نہ سکی۔ دیا نند نے ایک دو بار بات کرنی چاہی مگر وہ دوسری کروٹ آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔ اس کے دل و دماغ میں طوفان برپا تھا۔ کبھی ضرورتیں اسے اکساتی تو کبھی اخلاقی اقدار کا پلہ بھاری ہو جاتا۔ نو مہینے بچے کو کوکھ میں رکھ کر کسی اور کو دے دینا اور اس پر اپنا حق بھی نہ جتانا، کیا آسان ہوگا اس کے لیے؟ پھر دوسرے ہی پل ضرورتیں چلا چلا کر کہنے لگتیں۔

''اتنا پیسہ کبھی زندگی بھر نہیں کما سکتے جتنا نو مہینے میں کمایا جائے گا۔ بچوں کی پڑھائی دیا نند کی بیماری، پکی چھت، سب کام آسانی سے ہو جائیں گے۔ صرف کوکھ ہی تو کرایہ پر دینی ہے لوگ تو زندہ رہنے کے لیے خود کو بھی بیچ دیتے ہیں۔''

اس کشمکش میں ضرورتیں جیت گئیں۔ اخلاقی قدریں بھی تبھی اچھی لگتی ہیں اگر پیٹ بھرا ہو۔ بھوکے پیٹ تو بھجن بھی نہیں ہوتا۔

دیا نند کے پوچھنے سے پہلے ہی اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

دو دن بعد ہی اس کے ٹیسٹ شروع ہو گئے تھے۔ کئی روز اسے لگاتار اسپتال جانا پڑا تھا۔ ہری جھنڈی ملتے ہی کوکھ کرایہ پر دینے کا کام شروع ہو گیا تھا۔ آسٹریلیا کے ایک جوڑے نے اس کا انتخاب کیا تھا۔ ہندوستانی عورتوں کو یہ اس لیے بھی ترجیح دیتے ہیں کہ وہ سگریٹ اور شراب نہیں پیتیں اسی طرح بچے کی صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ پانچ مہینے وہ گھر پر ہی بچوں کے پاس رہی تھی پھر باقی کے تین مہینے اس نے اسپتال میں ڈاکٹروں کی نگرانی میں گزارے تھے۔ نویں مہینہ شروع ہوتے ہی بچگی ہوگئی۔ اس نے بچے کی صرف ایک جھلک ہی دیکھی۔ پھر اسے اس کے حیاتیاتی والدین کی گود میں ڈال دیا۔ خوشی سے ان کی آنکھیں چھلک آئی تھیں۔ انہوں نے پرجوش انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا اور کرایہ کے علاوہ اچھی خاصی Tip بھی دی۔ کوکھ خالی اور گود سونی ہوتے ہی ہلکی سی چبھن کانتی نے ضرور محسوس کی مگر بچوں کے خوش حال مستقبل کے آگے یہ چبھن پھیکی تھی۔ توقع سے زیادہ رقم ملنے کی خوشی سے اس کی آنکھیں بھی نم ہوگئی تھیں۔

چمپا کلی کی سسکیاں تھم گئی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے کانشی کی نیند خراب ہو۔ ماں کی طرح وہ اس کا خیال رکھتی تھی۔ باپ کے اچانک گزر جانے کے بعد ماں نے اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ جب تک اس کے گھر میں رہی ماں کی سوچ اور نگاہوں کے دائرے میں رہی۔ دو چھوٹے بھائی سرکاری اسکول جاتے تو وہ ماں کے ساتھ لوگوں کے گھروں میں برتن اور صاف صفائی کا کام کرتی۔ مردوں کی آنکھوں میں مچلتی ہوس نے ماں کو اس کے جوان ہونے کا احساس دلا دیا تھا۔ جوانی بھی اس پر ٹوٹ کر برسی تھی۔ بیوہ ماں سے بیٹی کو الہڑ جوانی سنبھالنے سے نہیں سنبھل رہی تھی۔ جنگلی بوٹی کی طرح اس کی خوبصورتی اور اس کے بدن کی لپٹیں دعوت حسن دیتی محسوس ہوئی۔ ماں کی راتوں کی نیند اڑ گئی۔ بیٹی کی آنکھوں میں بڑھتی چمک اور لبوں پر پھیلتی نمی نمی مسکراہٹ سے وہ لرز گئی۔ سیلاب آنے سے پہلے ہی ماں نے باندھ لگا دیا۔ اڑنے سے پہلے ہی اس کے پنکھ کاٹ دیے۔ شہر کی بستی سے اٹھ کر گاؤں کی کچی چھت والے مکان میں چلی آئی۔ سولہ سال کی عمر میں ماں نے گھر گرہستی کے جنجال میں پھنسا دیا۔ ساس سسر کے علاوہ تین دیور دو جوان ہوتی نندا ایک ہی چھت کے نیچے رہ رہے تھے۔ دو روٹی کا مسئلہ ادھر بھی تھا اور پیٹ کی آگ بجھانے کی جدوجہد اِدھر بھی۔ آسمان سے گری کھجور میں اٹکی۔

شادی کے سال بعد ہی چنٹو اس کی گود میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بن کر آیا۔ اس کی زندگی کو معنی مل گئے۔ سارا دن کولہو کے بیل کی طرح گھر کے کاموں میں جتی رہتی۔ چنٹو کی مسکراہٹ اس کے دن بھر کی تھکن پل بھر میں اتار دیتی۔ زندگی سے سب شکایتیں ختم ہوگئی تھیں۔

چنٹو نے بھی ماں بولنا ہی شروع کیا تھا کہ اس کا شوہر پورن اسے سسر کے بتائے پتے پر لے گیا۔ اس سے نہ کچھ پوچھا نہ کچھ بتایا بس اتنا ہی کہا کہ کچھ ٹیسٹ کروانے ہیں۔ کچھ پوچھنے کے لیے زبان کھولی تو بس اتنا ہی کیا:

''صبر سے کام لو گھر جا کر سب بتا دوں گا۔''

رپورٹ آنے تک سب نے چپی سادھے رکھی اور جب رپورٹ آئی تو بم کی طرح اس پر پھٹی۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ بہو کے فرائض میں یہ سب بھی شامل ہوگا۔ اس نے احتجاج کیا، چیخی، چلائی مگر بے سب بے سود۔ انہیں اپنی جوان ہوتی بیٹیوں کے لیے رقم درکار تھی اور اتنے کم وقت میں اتنی بڑی رقم صرف انہیں کوکھ کرایہ پر دے کر ہی مل سکتی تھی۔

سسر نے یہ کہہ کر منہ بند کرا دیا کہ:

''ہم نے تمہاری ماں سے کون سا جہیز لیا ہے۔ ہمیں تو بہت رشتے آتے تھے وہ تو تمہاری ماں کی بیوگی اور شرافت پر ترس آ گیا۔''

ساس نے دوٹوک بات کہہ دی:

''اگر ہمارے وقت میں یہ ہوتا تو ہم بھی کر لیتے۔ ویسے بھی ہر سال ایک بچہ جنا ہے۔ تم نے تو ابھی ایک ہی پیدا کیا ہے تمہیں کیا دقت ہے؟''

پورن میں اپنی بات کہنے کی ہمت نہ تھی وہ بھلا اس کی ڈھال کیسے بنتا۔ جن عورتوں کے شوہر والدین سے دب کر رہتے ہیں، ان عورتوں کی حق تلفی ہو ہی جاتی ہے۔

چنٹو کو چھوڑ کر گھر سے جاتے ہوئے اس کے دل پر منو بوجھ پڑ گیا تھا۔ کرایہ کی پیشگی رقم لے اور اسے اسپتال میں چھوڑ کر پورن واپس لوٹ گیا تھا۔ ممبئی کے تجارتی دکشت جوڑے نے اس کی کوکھ پانچ لاکھ میں خرید لی تھی۔

ہر اتوار پورن چنٹو کو ساتھ لے کر اسے ملنے آتا۔ اور ہر ملاقات کے بعد وہ اور زیادہ رنجیدہ ہو جاتی۔ وہ رات رو رو کر کاٹتی۔ اگلی صبح اسے پھر سے اتوار کا انتظار شروع ہو جاتا۔

دو مہینے میں ایک بار ممبئی سے دکشت جوڑا اس سے ملنے ضرور آتا۔ اس کی کوکھ میں پلنے والے اپنے بچے کی صحت دریافت کر کے مسز دکشت تو بچے سے باتیں کرنے لگتی یا پھر چمپا کلی کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اس کی ہلچل محسوس کر کے خوش ہوتی۔ چنٹو اور اس کے لیے ڈھیر سارے تحفے لانا کبھی نہ بھولتے۔ شروع شروع میں وہ ان سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھی گویا وہ اس کی مجرم ہو۔ پھر دھیرے دھیرے کچھ ملاقاتوں کے بعد مسز دکشت پر اسے رحم آنے لگا تھا۔ اسے لگتا تھا وہ تو اس سے بھی زیادہ غریب زیادہ مجبور ہے۔ احساس کمتری کا جذبہ دھیرے دھیرے غائب ہو گیا تھا۔ وہ پیسے کے دم سے اپنی محرومیاں پر کر رہے تھے، خوشیاں خرید رہے تھے اور وہ انہی پیسوں سے اپنی محرومیاں پر کر رہی تھی، خوشیوں کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔

معمول کی طرح صبح آٹھ بجے نرس ان کے کمرے میں بی پی چیک کرنے آئی تو چمپا کلی کا بی پی زیادہ تھا۔

''لگتا ہے تمہارا گھر والوں سے ملنا بند کرنا پڑے گا۔'' بزرگ نرس نے ڈانٹ کر کہا۔

''کیوں؛ یہ رات بھر روتی رہی ہے کیا؟'' پھول متی نے حیرت سے پوچھا۔

''تم گھر میں بھی اسی طرح بے سدھ سوتی ہو؟'' کانتی

نے پوچھا۔

''بھائی گھر میں وہ آرام کہاں جو ادھر ہے۔'' دوبارہ بستر پر لیٹ کر اس نے انگڑائی لیتے ہوئے جواب دیا۔

کانتی اور پھول متی کا بی پی بالکل درست تھا۔

''اس طرح کی سوچ ہونی چاہئے۔ سیکھ کچھ اس سے۔'' نرس چمپا کو سمجھاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

پھول متی اٹھ کر چمپا کلی کے بستر پر آ کر بیٹھ گئی۔

''تجھے کتنی بار سمجھایا اپنا خیال رکھا کر کوئی کسی کے لیے نہیں جیتا۔ مجھے دیکھ۔ میں بھی تو دو بچے پیچھے چھوڑ کر آئی ہوں۔ روتی ہوں کیا تیری طرح؟ میرے بچوں کے پاس تو عیاش، لاپروا، باپ ہے۔ دیکھ بھال کرنے کو۔ مگر تیرے بیٹے کو دیکھنے کے لیے تو پورا پریوار ہے نا؟''

''میرا دل نہیں لگتا اسے دیکھے بنا کیا کروں؟''

''یہ جو کر رہی ہے اس کے لیے ہی تو کر رہی ہے نا؟''

''میرے حصے میں کچھ نہیں آئے گا۔ کشٹ میں سہوں گی اور مزے وہ لوگ لیں گے۔'' اس نے کڑواہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

''تجھے تھوڑی ہوشیاری کرنی ہوگی۔ مجھے دیکھ۔ یہ سارا پیسہ میرے بینک کھاتے میں جائے گا۔ پھر دیکھنا کیسے دم ہلاتا آگے پیچھے گھومے گا۔ سمجھتا ہے میں کچھ جانتی نہیں گھر سے باہر کدھر منہ مارتا پھرتا ہے۔ اپنے اور اپنے بچوں کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے میں نے یہ قدم اٹھایا۔ اب کوئی پرواہ نہیں جس کے ساتھ مرضی چلا جائے۔ اس پیسے سے اپنی چھت کا انتظام کروں گی۔ بچوں کو تعلیم دلوادوں گی۔ اگر کانتی کی طرح ایک ہی بار میں میرے بھی تین بچے نہ سہی دو ہی کوکھ میں آجاتے تو کام کتنا آسان ہو جاتا۔ اگلی بار کے بارے میں نہ سوچنا پڑتا۔''

''تین بچے لے کر پھرنا آسان نہیں۔ یہ تو میں ہی جانتی ہوں۔'' کانتی جھٹ سے بولی۔

''جب قیمت دگنی مل رہی ہو تو تکلیف بھی برداشت ہو جاتی ہے۔'' پھول متی نے طنز کیا۔

''پیسہ بہت بڑا سہارا ہے۔'' کانتی نے مانا۔

''مرد سے زیادہ مضبوط۔'' پھول متی نے تصدیق کی۔ پھر وہ پلٹ کر چمپا کلی سے مخاطب ہوئی۔

''ایک بات بتا۔ گاؤں میں سارا دن کام کرتی تھی یا آرام؟''

''ہم جیسی عورتوں کے نصیب میں آرام کہاں؟''

''پھر تو تمہیں خوش ہونا چاہئے۔ سارا دن بتا تجھے کوئی کام ہے یہاں؟ کھالیا، پی لیا سولیا، باتیں کرلی، ٹی وی دیکھ لیا، ٹہل لیا۔ اوہ ہاں! تجھے تو رونے کا بھی بہت کام ہے۔'' پھول متی نے چٹکی لی۔

''مت تنگ کیا کرا سے ابھی چھوٹی ہے۔'' کانتی نے اس کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے دیکھ۔ میں صبح سویرے اٹھ کر گھر کے کام نپٹا کر آٹھ بجے فیکٹری پہنچ جاتی تھی۔ سارا دن گدھوں کی طرح کام کر کے شام کو گھر لوٹ کر پھر گھر کے کام۔ بچوں کو دیکھو پھر ان کے باپ کو بھی دیکھو۔ رات تھک ہار کر بستر پر گرو تو اس کے تقاضے پورے کرو۔ سب کی بھوک مٹاتے اپنا جسم چکنا چور ہو جاتا۔ اگلے دن پھر وہی صبح، پھر وہی دوڑ، یہاں کتنا آرام ہے۔ نہ کوئی سوچ نہ فکر۔ وقت پر کھانا اور وہ بھی متوازن غذا، وقت پر سونا اور دل لگانے کو تم جیسی سہیلیاں۔ بتا اور تجھے کیا چاہئے؟

بچہ ہی جننا ہے نا۔ گھر پر ہوتی تو تیری کوکھ کون سی خالی رہنے دیتا تیرا مرد۔ کیوں کانتی میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟''

''اسے تو صرف اپنے چنٹو سے دور رہنے کا غم ہے۔''

''میں تو جلد سے جلد چھٹکارا پا کر گھر جانا چاہتی ہوں۔'' چمپا نے کہا۔

''گھر جانا چاہتی ہوں۔ ایسے کہہ رہی ہے جیسے پھولوں کی سیج اس کا انتظار کر رہی ہے۔ آج لکھوالے مجھ سے اگلے سال پھر پیٹ سے ہوگی۔ پھر اس کی فکر کرنا۔'' یہ کہہ کر پھول متی اٹھ کر اپنے بستر پر چلی گئی اور چمپا اٹھ کر چہل قدمی کرنے راہداری میں آ گئی۔

اسپتال کے اوپر کی دو منزلیں صرف حاملہ عورتوں کے لیے بنی ہیں۔ پیٹ نکالے ڈھیلے ڈھالے چوغا پہنے اندر باہر آرام سے چہل قدمی کرتی، ایک دوسرے کا حال پوچھتی باتیں کرتی ہیں۔ باہر کے کسی شخص کو وہاں آنے کی اجازت نہیں۔ ملاقات کے لیے انہیں نیچے ہال کمرے میں جانا پڑتا ہے۔

چمپا ٹہل کر کمرے میں پہنچی تو کانتی کی حالت دیکھ کر حیران ہوگئی۔ اسے لیبر پین شروع ہو چکی تھی ابھی تو نواں مہینہ شروع ہی ہوا تھا۔ اسی وقت ڈاکٹر نرس جمع ہوگئے۔ مسٹر اور مسز اسمتھ دو مہینے پہلے ہی لندن سے اس وقت کے لیے آ چکے تھے۔ انہیں فون کر کے بلا لیا گیا۔ زچگی کے وقت وہ بھی وہیں موجود تھے اور بے صبری سے اپنے بچوں کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی، تین بچوں کو ایک ساتھ اس نے جنم دیا۔ بیٹی اور بیٹوں کو گود میں اٹھا کر ان کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے اور ساتھ ہی حیرت کے تاثر بھی ان کے چہروں پر نمایاں تھے۔ ڈاکٹرز خود حیران پریشان تھے۔ دو بچوں کا رنگ روپ، آنکھیں بالکل مسز اسمتھ جیسا اور ایک بیٹے کی رنگت اس کے سر کے بال بالکل کانتی جیسے۔ سارے اسپتال میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

مسٹر اور مسز اسمتھ تینوں بچوں کو لے کر چلے گئے تھے اور کچھ ہدایتیں ڈاکٹرز کو دے گئے تھے۔ کانتی کو بھی اس کے پورے کرایہ کی رقم مل گئی تھی۔ دیا نند اسے لینے آ گیا تھا مگر دونوں کے چہروں پر خوشی نہیں تھی بلکہ ایک پھانس سی چبھ گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے اپنی تفتیش شروع کر دی تھی۔

کانتی کے جاتے ہی اس کے بستر پر تین ماہ کی حاملہ عورت آ گئی تھی۔

مقررہ تاریخ پر مسٹر اور مسز دکشت بھی اسپتال پہنچ گئے تھے۔ چمپا کلی سے زیادہ بے چینی انہیں تھی۔ جچگی سے پہلے مسز دکشت اسے ملنے آئی اور بڑا حوصلہ دیا۔ چمپا نے روندھی ہوئی آواز میں اسے اتنا کہا:

''اگر مجھے کچھ ہو جائے تو آپ میرے چنٹو کی مدد بھی کریں گی نا؟''

''تم فکر نہ کرو۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا مجھے ڈاکٹروں پر پورا بھروسہ ہے۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ ہم آج بھی تمہارے ساتھ ہیں کل بھی رہیں گے۔''

چمپا کے چہرے پر پرسکون کی لہر دوڑ گئی۔

چمپا نے ایک تندرست بچی کو جنم دیا اور جنم ہوتے ہی ڈاکٹروں نے اسے مسز دکشت کی گود میں ڈال دیا۔ وہ دونوں بچی کو پا کر ساتویں آسمان پر تھے۔

جانے سے پہلے چمپا کا شکریہ بھی ادا کیا، اپنی خوشی سے اچھی خاصی رقم Tip میں دی اور چنٹو کے لیے تحفے بھی۔ مسز دکشت نے بچی کو اس کے آگے کرتے ہوئے کہا:

''ہماری بچی کو آشیرواد نہیں دوگی۔''

چمپا نے جھک کر بچی کی پیشانی چوم لی۔ دو قطرے اس کی آنکھوں سے لڑھک کر بچی کے رخساروں پر چمکنے لگے۔ پھر اس نے اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

Tip کی رقم اس نے چھپا کر اپنے سامان میں رکھ لی۔ پورن اسے گھر لے جانے کے لیے نیچے آ چکا تھا۔ آج پھول متی کا چہرہ بھی اداس بجھا ہوا تھا۔ آنکھیں نم تھیں۔ پھول متی سے گلے مل کر جب وہ وہاں سے نکلنے لگی تو اس کی آنکھ بچا کر دھیمے سے اس نے نرس سے پوچھا۔

''سسٹر کتنے سالوں بعد دوبارہ یہاں آسکتے ہیں؟''

اس کے جواب سے پہلے ہی پھول متی کا زوردار قہقہہ گونجا اور وہ سٹپٹائی سی تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

غزالہ قمر اعجاز

مجھے بھی

زناٹے دار تھپڑ کی آواز اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ تھوڑی دیر کے لیے سب دہل گئے.....مگر اس سے زیادہ دہلا دینے والی اس کے بعد کی خاموشی تھی۔ سپنا اپنا گال سہلاتے ہوئے سب کی طرف باری باری دیکھ رہی تھی۔ کوئی کچھ نہیں بولا.....اس کی نظر ماں کے پاس آ کر ٹھہر گئی۔ میلی ساڑی کا آنچل ہاتھوں میں تھامے وہ اپنے تیزی سے گرتے آنسوؤں کو پونچھ رہی تھی۔ ابھی تو اتنی زور کا طمانچہ مارا تھا اور اب خود ہی.....اس نے ایک بار پھر سب کی طرف دیکھا.....مگر معاملے کی شدت کا اندازہ کرتے ہوئے سب ایک ایک کر کے باہر نکل گئے اور کمرے میں ماں بیٹی کی سسکیاں ایک ساتھ گونجتی رہیں۔ بے حال ہو کر سپنا کی ماں بسنتی دیوار کے سہارے لگی لگی زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی سپنا بھی بیٹھ گئی۔

''ماں'' اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔ بسنتی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ بولنے کی کوشش میں اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ بیٹی کا دکھ تو مائیں بغیر کہے ہی سمجھ لیتی ہیں.....اور یہاں تو بیٹی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ بے اختیار ہو کر اس نے سپنا کو سینے سے لگا لیا۔

''یہ کیا کیا تو نے۔'' ہچکیاں رکیں تو بسنتی نے بیٹی سے پوچھا۔ ''میں اور کیا کرتی ماں۔''

''چپ رہتیں..... جو ہوا اسے بھولنے کی کوشش کرتیں۔''

''بھولتی کیسے ماں۔''

سپنا کے آنسو پھر بہنے لگے۔

''ان کو سزا تو ملے گی نا ماں۔''

آس بھری نظروں سے اس نے ماں کو دیکھا۔

''پتا نہیں.....مگر اس سے تیرا دکھ تو کم نہیں ہوگا نا۔''

''بیٹی سپنا۔''

ہمیشہ بے حد رعب میں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر چیخنے چلانے والے کا کانے نرم لہجے میں اسے پکارا۔

''وہ لوگ آ گئے ہیں۔ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔''

سپنا کے چہرے پر گھبراہٹ اور لاچاری کے کئی رنگ ایک ساتھ ابھرے۔ اس نے کس کر ماں کو جکڑ لیا۔ نئی ساڑی کا پلو برابر کرتے ہوئے چاچی اندر آئیں اور زور سے اس کا ہاتھ کھینچا۔

''پہلے منہ تو دھو لے بیٹی۔'' سپنا کے ساتھ بنتی بھی کھڑی ہو گئی۔

''نہیں نہیں ایسے ہی ٹھیک ہے۔ سب کو پتہ تو چلے کس دکھ سے گزری ہے۔''

چاچی اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے باہر کی طرف بڑھیں۔ سپنا مڑ مڑ کر ماں کو دیکھتی رہی۔ وہ بھی مرے مرے قدموں سے آنگن تک آئی..... مگر پھر دالان میں رک گئی۔ میری بیٹی کا دکھ کوئی تماشہ ہے کیا جو سب کو دکھایا جائے گا۔ آنگن دیکھتے ہی دیکھتے خالی ہو گیا۔ راہداری سونی ہو گئی اور باہری دروازہ بند ہو گیا۔ پتہ نہیں اب کیا ہوگا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سزا.....سپنا کا بھولا بھالا معصوم چہرہ نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ اس بڑی حویلی کے اوسارے میں بنی کوٹھری میں اپنی زندگی کے قیمتی ماہ و سال اس نے کاٹ دیے تھے۔ اس کوٹھری کا اندھیرا جب اس کا مقدر بنا تو باہر کے اجالے سے اس نے خود ہی اپنا منہ موڑ لیا۔ اوسارے کے دوسرے کونے میں بھینس بندھی تھی جو بغیر کسی شور و ہنگامے کے سارا سارا دن وہاں کھڑے ہو کر چارہ کھاتی اور پھر بیٹھ کر جگالی کرتی رہتی۔ رسوئی کے کام سے فارغ ہو کر وہ بھی دالان کے پائے سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی اور اسے تکتی رہتی۔ یہ سزا ہی تو تھی اس کی.....بس اس کال کوٹھری کا دائرہ کچھ بڑا تھا جسے اس کے اپنوں نے اس کے لیے چنا تھا۔ پہلے دم گھٹتا.....مگر اب باہری دنیا کا تصور اس کے رونگٹے کھڑا کر دیتے..... باہری دنیا..... جہاں لڑکی کا وجود صرف اس کا جسم تھا اور وہ جسم مردوں کے ہاتھوں کا کھلونا۔ جب چاہو جیسے چاہو کھیلو۔ وہ اپنے آپ میں سمٹ گئی۔ سپنا.....میری بچی، ایک بار پھر وہ چیخی اور اپنا سر پیٹنے لگی..... یہ بات اس کی سمجھ سے پرے تھی کہ ان گزرے ہوئے سالوں میں دنیا اتنی کیسے بدل گئی کہ وہ عورت کو انصاف دینے لگے۔ جب کہ ماں تو بالکل نہیں بدلی۔ میری ماں نے بھی مجھے ہی تھپڑ لگایا تھا اور آج میں نے بھی سپنا پر پہلی بار ہاتھ اٹھایا تھا تو کیا میری ماں بھی.....وہ بھی تو آخر عورت ہی تھی.....مردوں کے سماج میں ان کے لیے صرف ایک جسم..... ماں.....تو کیا..... میری ماں بھی..... وہ لرز گئی..... چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ پھر چپ ہوئی تو اسے اپنے ہاتھوں کو چہرے سے سرکاتے ہوئے گردن اور سینے سے ہوتے ہوئے جانگھوں تک لائی اور پھر پنڈلیوں پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ کتنا درد ہوا تھا اس دن..... وہ چلائی تھی تو اس کے گال پر ایک زور کا تھپڑ مارا تھا۔ اس کا پورا بدن سنسناتے ہوئے ہل رہا تھا اور وہ ادھ مری سی پڑی تھی۔ اس نے زور زور سے اپنی گردن اور سینے پر ہاتھ پھیرے۔ پتہ نہیں قدرت نے عورت کے جسم میں ایسا کون سا نمک ملایا ہے کہ طاقتور سے طاقتور مرد بھی اس کے آگے اوندھے منہ گرنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ اس نازک سی کھال میں کون سی لذت بھری ہے کہ عورت کو جوتے کی نوک پر رکھنے والا مرد اس کے تلوے چاٹنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے اور اپنی اس شکست کو اپنی طاقت سمجھ کر خوش بھی ہوتا ہے۔ یہ خصلت تو جانوروں میں پائی جاتی ہے، جسے چابک مار کر گلے میں پٹا ڈال کر قید میں رکھا جاتا ہے اور یہ آدمی نما جانور آزاد بغیر کسی روک ٹوک کے گھومتا پھرتا ہے اور سزا کاٹتی ہے تو عورت.....قصوروار ہوتی ہے تو عورت..... ذلیل ہوتی ہے تو صرف عورت..... بدنام ہوتی ہے تو بھی عورت.....سوالوں کے کٹگھرے میں کھڑی ہوتی ہے تو صرف عورت..... کیا پہنا تھا..... کہاں گئی

فلیٹ نمبر 2533، ٹاورای، ایونیو 12، گورسٹی۔2، گریٹر نوئیڈا (ویسٹ)، گوتم بدھ نگر۔201009
فون: 07070789512

تھیں..... کیوں گئی تھیں۔ رسوا ہوتی ہے تو عورت..... زندہ درگور ہوتی ہے تو صرف عورت۔ جیسے وہ دل میں ہوک اٹھی اور وہ ایک بار پھر تڑپ گئی۔ یہی تو ہوا تھا اس کے ساتھ۔ روز کی طرح گلے میں بستہ ڈال کر وہ سہیلیوں کے ساتھ اسکول جانے کے لیے تیار تھی۔ ماں دروازے تک آئی۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سیدھے اسکول جانے کی تاکید کی اور ساڑی کے کنارے سے بندھا سکہ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ دادی نے رسوئی سے جھانک کر اس منظر پر آنکھیں دکھائیں اور چمٹا زور سے پھینکتے ہوئے بدبدائی تھیں۔ پڑھ لکھ کر جیسے افسر ہی لگ جائے گی۔ ماں نے اشارے سے اسے جانے کے لیے کہا وہ آگے بڑھی اور سہیلیوں کے جھرمٹ میں گم ہوگئی۔

اسکول کے پاس پہنچ کر یاد آیا کہ انگریزی کی کاپی ٹیوشن کے بعد ماسٹر صاحب کے گھر ہی بھول آئی تھی۔ آج جمع ہونی ہے۔ ورنہ انگریزی والے ماسٹر صاحب ہتھیلی پر دو ڈنڈا مارتے اور ایک گنتے۔ اس نے کل ہی مہندی لگائی تھی۔ سرخ سرخ ہاتھ دیکھ کر دادی نے کہا تھا:

''سسرال میں بہت لاڈ ملے گا۔''

''ابھی تو آٹھویں میں ہے میری لاڈو۔ بارہویں کے بعد بیاہ کروں گی۔'' ماں نے ایسے گلے لگایا مانو وہ ابھی رخصت ہو رہی ہو۔ وہ پہلے ہنسی پھر شرما گئی۔

''دیکھ شادی کی بات پر کتنا خوش ہو رہی ہے۔'' چاچی نے ٹہوکا لگایا تو وہ ماں کے سینے میں دبک گئی۔

ماسٹر جی کے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ آواز لگاتی اندر چلی گئی۔ سامنے بنے حوض پر کوئی نہا رہا تھا۔

''ماسٹر جی کہاں ہیں۔'' اس آدمی نے مڑ کر پہلے آدھی کھلی آنکھوں سے دیکھا پھر آنکھیں پھٹتی چلی گئیں اسے عجیب لگا۔ وہ مڑی۔ کنارے میز پر کئی کاپیاں رکھی تھیں وہ چھانٹنے لگی..... تبھی کسی نے پیچھے سے اسے دبوچ لیا، گیلا گیلا بدن..... خوف سے اس کی آواز بند ہوگئی۔ ''ماسٹر جی تو شہر گئے ہیں، میں پڑھاؤں کیا۔''

وہ اسے کھینچتے ہوئے کمرے میں لے آیا، کمزور نازک سی لڑکی ان بھاری بانہوں سے خود کو آزاد کرنے کی کوشش میں تڑپتی رہی۔ گرفت بڑھتی گئی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ ''جانے دو..... چھوڑ دو'' کی آواز دھیمی ہوتی گئی۔ سسکیاں اندر ہی اندر گھٹ گئیں۔

'جا'

پتہ نہیں کتنی دیر بعد ایک جھٹکے سے ہٹتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ بال نوچ کر..... دانت کاٹ کر..... شور مچا کر سب کو اکٹھا کر کے اس کی ہڈیاں تڑواؤں گی..... اس نے سوچا تھا مگر اٹھنا تو دور اس سے ہلا بھی نہیں گیا۔ دروازہ کھلا پھر بند ہوگیا۔ بہت دیر بعد وہ اٹھ سکی اور لڑکھڑاتے ہوئے گھر پہنچی۔ ماں رسوئی میں تھی۔

''آج اتنی جلدی آ گئی۔'' کمرے میں آتے ہی ماں نے پہلا سوال کیا..... پھر اس کی حالت دیکھی۔

''کیا ہوا..... کہاں تھی۔''

''ماں..... میں.....''

وہ ماں کے سینے سے لگ گئی۔ سوجا ہوا چہرہ..... داغ دار گردن..... الجھے بال..... ہاتھوں پر کھرونچ کے نشان..... پھٹا ہوا اسکول کا ڈریس۔

''کہاں تھی۔'' ماں اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ سینہ پیٹ رہی تھی اس کی حالت دیکھ رہی تھی..... پھر دو تھپڑ بھی اسے لگا دیے وہ اوندھے منہ فرش پر گر پڑی۔ اٹھی تو ماں نے کہا تھا ''کسی سے کچھ مت کہنا۔'' پھر غسل خانے میں بالٹی بھر بھر کے لائی اور دیر تک اسے نہلاتی رہی۔ پانی کی دھار کے ساتھ دونوں کے آنسو بھی بہتے رہے۔ وہ کوٹھری میں قید ہوگئی۔ ماں انگلیوں پر دن گنتی رہتی اور رات کو دیر تک دادی اور باپو کے ساتھ کھسر پھسر ہوتی رہی۔ ایک دن ماں نے بتایا کہ اگلے ہفتے اس کی شادی ٹھہر گئی ہے۔ ٹیوشن پڑھاتے ہوئے ماسٹر جی اکثر کہتے بسنتی سب سے تیز سوال کا جواب دیتی ہے اور سمجھ نہ آنے پر سوال بھی بہت کرتی ہے۔ پڑھ لکھ کر وکیل بنے گی۔ مگر اس وقت اس نے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ بس آنکھیں پھاڑے ماں کو دیکھتی رہی۔ اس کا بستہ ماسٹر جی کے گھر ہی چھوٹ گیا تھا۔ جہاں اب تالا لگا تھا۔ اس کا بیاہ ہوگیا۔ نا کوئی مہمان آئے نا گیت گانا ہوا۔ بھلا ایسے ہوتا ہے کسی کا بیاہ مگر وہ کچھ نہیں پوچھ پائی۔

''بھرے گھر میں جا رہی ہو..... پیہر کا مان رکھنا..... کتھا سنانے مت بیٹھ جانا۔ ایسی لڑکی کو بھلا کون اپناتا ہے۔'' دادی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تھا۔ ماں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا کر ساتھ آئی عورت کو پکڑا دیا۔ لمبے گھونگھٹ کی آڑ سے اسے کچھ نہیں دکھا۔ بس کانوں میں دادی کا آخری جملہ گونجتا رہا۔

ایسی لڑکی کو کون اپناتا ہے..... کیسی لڑکی..... کیا کیا ہے اس نے۔ ہمیشہ سب سے تیز جواب دینے والی لڑکی کا دماغ اس سوال پر گھوم گیا۔ اور وہ پورے راستے جواب کھوجتی رہی۔ گاڑی رکی تو اس نے سر اٹھایا۔ بڑی سی حویلی تھی۔ اتنے امیر لوگ ہیں۔ میرے لیے نیا بستہ اور کتابیں تو لے ہی آئیں گے۔ پھر میں اسکول جاؤں گی اور وکیل بن کر سب کو سزا دلواؤں گی۔

لمبی راہداری پار کر کے وہ حویلی کے پچھواڑے والے دالان میں آ گئی۔ پتہ نہیں کدھر سے تین چار عورتیں ہنستے ہوئے آئیں اور پوجا کی تھالی اس کے آگے بڑھائی۔ ٹیکہ لگایا اور سامنے کے دروازے سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ ڈرتے ڈرتے اندر گئی۔ چھوٹی سی کوٹھری کے ایک کونے میں ہلکی روشنی والا بلب لٹک رہا تھا۔ چاروں طرف سامان بکھرا تھا اور عجیب سی بدبو بسی تھی۔ ڈر کے مارے اس نے گھونگھٹ الٹ دیا..... اور چیخنے ہی والی تھی کہ آس پاس عورتوں کو دیکھ کر خاموش رہی..... پھر دھیرے دھیرے اس نے اپنی چیخوں کو اپنے اندر دبانا سیکھ لیا۔ اس کا پتی گونگا تھا..... بھونڈی سی صورت..... پیلی بنڈی اور نیکر پہنے اسے عجیب سی نظروں سے گھور رہا تھا۔ اسے کراہیت ہوئی، جی متلایا اور کوٹھری میں آتے آتے اسے الٹی ہوگئی۔ سر تھام کر وہ دالان کے پائے سے سر ٹکا کر بیٹھ گئی۔ گونگا کوٹھری میں رکھی کسی چیز کو زور زور سے پٹک رہا تھا۔ باہر کا موسم پرسکون تھا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ چاند کی روشنی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ بہت دیر تک وہ تاروں کو گنتی رہی۔ کتنا فرق تھا آسمان اور زمین کی دنیا میں۔ اوپر روشنی تھی چمک تھی اور نیچے صرف اندھیرا۔ کوٹھری سے اٹھا پٹک کی آواز آنا بند ہوگئی..... تبھی دوسرے چھور پر بندھی بھینسوں کی بے ہنگم آواز نے اداس ماحول کو ڈراؤنا بنا دیا۔ وہ سہم گئی۔ نیند کی جھپکی آئی تو وہ کبھی آگے کی طرف گرتی تو کبھی پیچھے کی طرف۔ رات کا اندھیرا چھٹنے لگا تو وہ کوٹھری میں آ گئی۔ گونگا اوندھے منہ سویا خراٹے لے رہا تھا اور بیچ بیچ میں عجیب عجیب سی آوازیں بھی نکال رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے رال ٹپک رہی تھی جسے ایک بار اس نے زبان سے چاٹ کر اندر کیا اور دوسری بار ہاتھ سے منہ کو رگڑا۔ لاچاری سے اس نے باہر کی طرف دیکھا اور پھر کونے میں دبک کر لیٹ گئی۔ وہ یہاں نہیں رہے گی..... ایک دن بھی نہیں۔ گال پر بہتے آنسوؤں کو اس نے بے دردی سے پوچھا..... مگر ہچکیاں کم نہیں ہوئیں..... اور پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔ گردن میں لپٹی چنری کو کسی نے زور سے کھینچا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ گونگا غضب ناک تیور سے اسے گھور رہا تھا اور اشارے سے کچھ کہہ بھی رہا تھا۔ دروازہ سامنے تھا وہ تیزی سی نکلی۔

''ارے کہاں بھاگ رہی ہو۔ نہا دھو کر رسوئی میں آؤ۔'' کونے میں ٹین کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ غائب ہوگئیں۔ چند دنوں میں ہی اس کا ایک معمول بن گیا۔ سویرے سے دوپہر تک اس کا وقت رسوئی

میں گزرتا۔اس کے بعد وہ بھینسوں کو چارہ کھلاتی.....ان کے آس پاس صاف صفائی کرتی پھر دالان میں بیٹھ کر انہیں نہارتی رہتی۔بھینس کی مثال اس نے کئی بار سنی تھی۔کالی جیسے بھینس، موٹی جیسے بھینس۔مگر اب اسے اپنی اور بھینس کی صبح شام میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آرہا تھا۔کتنی ملتی جلتی زندگی تھی دونوں کی۔ اکیلے چپ چاپ .....دوسروں کے بنائے گئے اصولوں پر جیے جانا.....اپنے اپنے کونوں کو اپنی قسمت سمجھ کر قبول کر لینا.....نا کوئی سوال، نا کوئی فریاد.....نا کبھی بھاگنے کی کوشش اور نا ہی کبھی غصہ یا جھنجھلاہٹ کا اظہار۔چارہ ڈال دیا جاتا تو خاموش کھڑی کھاتی رہتی اور پھر بیٹھ کر جگالی کرتیں۔نظر ایک نقطے پر ٹکی ہوتی۔پتہ نہیں ان کے پاس زندگی کا ایسا کون سا پیچیدہ مسئلہ ہے جسے سلجھانے میں وہ اپنی سدھ بدھ بھی کھو چکی تھیں۔ حویلی کی باقی عورتیں سجتی .....سنورتیں.....ہنسی ٹھٹھولے کرتیں.....مگر اسے دیکھ کر ایسے خاموش ہو جاتیں جیسے وہ کوئی چڑیل ہو یا ڈائن۔وہ کسی سے کہتی بھی تو کیا.....گھر والے تو اسے بھول ہی چکے تھے شاید ماں بھی۔گونگا آج کل صاف ستھرا رہنے لگا تھا۔خوب دیر دیر تک نہاتا۔شیشہ دیکھتے ہوئے بال سنوارتا۔ کبھی کریم لگاتا تو کبھی بالوں میں تیل.....جو ماتھے سے ہوتا ہوا گردن پر آجاتا۔اسے خوب ہنسی آتی۔اس کو ہنستا ہوا دیکھ کر وہ خوش ہو جاتا۔ایک دن اس کے لیے ہار بندے بھی لایا تھا۔ پہنے تو خوب تالیاں بجائیں۔گھر کی دوسری عورتوں کو بلا کر دکھایا۔سب گونگے پر اور اس پر دیر تک ہنستی رہیں۔

اس دن اس کا جی خراب تھا۔سر میں درد تھا۔اس کا اٹھنا بھی محال تھا۔سارے دن بھوکی پیاسی وہ کوٹھری میں پڑی رہی۔اب تو نڈھال سی ہوگئی تھی۔تبھی گونگا پلیٹ میں کھانا لے کر آیا۔اس کو اٹھایا بھی اور لقمہ بنا کر کھلایا بھی۔وہ شاید اتنا برا نہیں تھا جتنا وہ اسے سمجھ رہی تھی۔پتہ نہیں اوپر والا کبھی کبھی اتنا کنجوس کیسے ہو جاتا ہے۔اسے زبان نہیں دی تھی تو تھوڑی سی عقل ہی دے دیتا۔اوپر سے اس کا بوجھ بھی اس پر ڈال دیا۔دائی نے بتایا تھا کہ اسے پانچواں مہینہ ہے۔''اتنی کمزور ہے پتہ نہیں بچہ جن بھی پائے گی یا نہیں۔'' ساتھ کھڑی جٹھانی سے اس نے کہا تھا۔''دن بھر رسوئی میں ہی تو رہتی ہے۔جو مرضی کھاؤ پیو۔کوئی روک ٹوک ہے کیا۔''

جٹھانی لاولد تھیں۔انہوں نے اعلان کر دیا کہ بچہ ان کا رہے گا۔

''یہ اپنا جیون ہی پار لگا لے بہت ہے۔''

ناک سکوڑتے ہوئے انہوں نے کہا اور مٹکتے ہوئے چلی گئیں۔بیٹی ہونے کا سن کر ان کی بھنویں تن گئیں۔''ہمیں تو لڑکا چاہئے تھا۔'' کہہ کر پلا جھاڑ لیا۔مگر پھر سب کے سمجھانے پر راضی ہو گئیں۔

''گو موت نہیں ہوگا ہم سے۔''اپنے چکنے ہاتھوں کو سہلاتے ہوئے انہوں نے کہا۔بسنتی خوش ہوگئی۔اس بہانے ہی سہی بچی تو پاس رہے گی۔جٹھانی کی اس رحم دلی پر اس نے ان کے لیے دل سے دعا کی۔

گونگا کئی دنوں سے گھر نہیں آیا تھا۔

''کہیں دور چلا گیا ہوگا.....راستہ یاد آئے گا تو خود ہی آجائے گا۔''

گھر والوں نے کہا تھا۔مگر کھیتوں میں کام کرنے والے ہریا کا کہنا تھا کہ اس نے گونگے کو ندی کی طرف جاتے دیکھا تھا مگر آتے ہوئے اس کی نظر نہیں پڑی۔جانے راستہ بھول گیا کہ ندی میں ڈوب گیا۔پکے طور پر کوئی کچھ نہیں کہہ سکا۔نا ہی کچھ پتہ لگا۔ہار بندے دیکھتے ہوئے وہ اکثر گونگے کو یاد کرتی۔ سپنا بڑی ہو رہی تھی اور اپنی توتلی زبان میں خوب باتیں کرتی۔جٹھانی کا گھر میں خوب رعب تھا۔کاروبار سب بڑے جیٹھ جی کے ہاتھ میں تھا۔ باہری کوٹھری سے وہ اندر کے کمرے میں آگئی۔نہلا دھلا کر وہ سپنا کو جی جی کی گود میں دے دیتی۔ جب تک وہ کھیلتی بی بی اس سے اپنا دل بہلاتی رہتیں اس کے روتے ہی وہ بسنتی کی گود میں آجاتی۔ سپنا سے کھیلتے ہوئے اس نے جیٹھ جی کو پہلی بار دیکھا تھا۔دودھ کی بوتل لیے وہ جی جی کے کمرے میں گئی مگر جیٹھ جی کو دیکھتے ہی وہ واپس جانے کے لیے مڑی۔

''لے جاؤ بسنتی.....بٹیا سوئے گی اب۔''

اس کے بے حد قریب آکر ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولے۔وہ پسینے پسینے ہوگئی۔عجیب تھی ان کی سانسیں اور آنکھیں۔ سپنا کا کا سے خوب گھل مل گئی تھی۔ ان کے ساتھ کھیلتی اور توتلی زبان میں باتیں کرتی۔اس کی گود میں سپنا کو دیتے ہوئے وہ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتے۔ اس دن سوتے ہوئے اس کی آنکھ آہٹ سے کھل گئی۔اس نے کنڈی لگائی تھی.....پھر دروازہ بند ہوگیا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتی کسی نے اس کو دبوچ لیا۔گرم گرم سانسیں اس کے چہرے اور گردن کو جلا رہی تھیں۔

''جیٹھ جی.....آپ.....چھوڑیے۔'' بے ربط سے الفاظ اس کے منہ سے نکلتے ہی انہوں نے اپنا بھاری ہاتھ اس کے چہرے پر رکھ دیا۔آواز اندر گھٹ گئی۔آج بھی وہ اتنی ہی کمزور ثابت ہوئی جتنی اس دن تھی۔اس کا جسم کسی کھلونے کی طرح جیٹھ جی کی بانہوں میں تھا اور ان کے ہونٹ اسے زخمی کرتے رہے۔ان کو مارنے کی..... دانت کاٹنے کی یا پھر بال نوچ کر شور مچانے کی کوئی تمنا اس کے اندر پیدا نہیں ہوئی۔وہ ایسے ہی دبکی پڑی رہی۔''حویلی میں پتہ بھی نہیں ہلتا میرے اشارے کے بغیر۔'' دھوتی باندھتے ہوئے وہ بولے اور کنڈی کھول کر باہر چلے گئے۔جیٹھ جی کا رعب برقرار رہا۔ سپنا بڑی ہوتی گئی اور کمرے کی کنڈی کھلتی بند ہوتی رہی۔دن کا اس کا زیادہ تر وقت رسوئی میں گزرتا۔بی بی سپنا کو پڑھائی میں مدد کرتیں..... پتہ نہیں کیوں جب تک وہ اسکول سے نہ لوٹ آتی وہ بے چین رہتی اور اس دن پھر ایک انہونی ہوگئی۔چھٹی کے بعد سب بچے گھر آگئے تھے مگر سپنا نہیں آئی تھی۔گھڑی آگے بڑھتی رہی.....بسنتی کی سانسیں اٹکی رہیں۔ رات گزری.....سویرا ہوا۔گاؤں والوں کے ساتھ اب پولیس بھی تلاش میں جٹ گئی۔پھر پتہ چلا سپنا پولیس اسٹیشن میں ہے۔ پھٹے کپڑے اور بے حال..... جہاں سے اسے سرکاری اسپتال لے جایا گیا۔لوگ طرح طرح کی خبریں آآ کر سناتے رہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ وہ اسکول کے بعد کاپی خریدنے گئی تھی اور وہیں سے دو لڑکوں نے اسے اغوا کر لیا اور سرکٹ ہاؤس لے گئے۔ جہاں چار لوگوں نے رات بھر اس کے ساتھ.....کی اور جاتے وقت نالے میں دھکیل دیا۔بے ہوشی کی حالت میں پولیس نے اسے برآمد کیا تھا۔جنگل کی آگ کی طرح یہ بات ہر طرف پھیل گئی۔سرکٹ ہاؤس کا رجسٹر پولیس کے قبضے میں تھا اور تفتیش شروع ہوگئی۔ اخبار اور ٹی وی کے رپورٹرز نے گاؤں میں ڈیرا ڈال لیا۔ سپنا کو انصاف دلانے کی ہوڑ لگ گئی۔ پردھان سے لے کر دیش کی سرکار نشانے پر تھی اور پھر صلاح مشورے کے بعد دہلی میں دھرنے پر بیٹھنے کا اعلان ہوگیا۔جیٹھ جی کو اپنے نیتا بننے کے راستے صاف نظر آرہے تھے۔جی جی سے انہوں نے کہا تھا:

''جب تک اسمبلی کا ٹکٹ نہیں ملے گا ہم کسی بھی طرح کا سمجھوتہ نہیں کریں گے۔''

گھر کی تمام عورتیں جانے کی تیاری میں لگ گئیں۔ اندھیرے کمرے میں اپنی قسمت پر ماتم کرتے ہوئے بسنتی سب سنتی رہی۔ پھر ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی اور دوڑتے ہوئے آنگن پار کر کے باہری دالان میں آگئی۔''مجھے بھی دھرنے پر جانا ہے۔مجھے بھی انصاف چاہئے۔''

گھونگھٹ الٹتے ہوئے اس نے جیٹھ جی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔میڈیا والوں کے کیمروں نے اس لمحے کو منجمد کر دیا۔

☆☆

رخشندہ روحی مہدی

ہم سخن تیری خاموشی ہے ابھی۔۔۔

''**السلام علیکم**۔مسٹر محمد علی پارکر۔۔''

''والسلام۔۔جی میں محمد علی پارکر؟''

''آپ کی ہیلپ مل سکتی ہے۔؟''

''جی.....شیور.....پرابلم بتایئے۔۔''

''کل شام آٹھ بجے۔۔مع اسلامہ''

میں نے اپنا سیل فون دیکھا.....اسکرین پہ چمکتے میسیج کو میں نے ڈیلیٹ نہیں کیا۔

کون ہوسکتی ہے.....میری مدد کیوں چاہتی ہے.....!

میرے فون کی میسیج ٹون بجی۔کل والا ہی وقت .....رات آٹھ بجے.....

وہی میسیج .....آج میں نے جواب نہیں دیا۔نہ جانے کیا چاہتی ہے۔میرے بدن میں بے چینی سی ہوئی.....

میرا اپوائنمنٹ چار سال پہلے کاؤنسلر کے طور پر ریاض میں ایک امیریکن کمپنی میں ہوا تھا۔دہلی سے زیادہ پیچیدہ مسائل مجھے یہاں کم ہی نظر آئے۔زیادہ تر میرا کام کالج کے طالب علموں کی کاؤنسلنگ کرنا ہے۔جمعہ کے اخبار میں شائع میرے انٹرویو کو پڑھ کے یہ پہلا فون آیا ہے اور وہ بھی ایک لڑکی کا۔دل میں ایک تجسس تو ہے ہی لیکن ذرا سا ڈر بھی محسوس ہونے لگا۔

دن بھر آفس کی مصروفیت اور گھر آتے ہی اسکا میسیج .....آج اس بات کو تین دن ہوگئے.....میرے پاس اس لڑکی کا سیل فون نمبر نہیں آیا.....بس پرائیویٹ نمبر اسکرین پہ فلیش ہوتا رہتا ہے۔

.....کیسے اس کا سراغ لگ سکتا ہے۔کسی سے ذکر بھی نہیں کرسکتا۔کہیں واقعی کوئی مصیبت زدہ نہ ہو۔آج میں اس کے میسیج کا جواب دے ہی دوں گا.....رات کے آٹھ بجتے ہی وہ میسیج.....

''السلام علیکم.....آپ کی ہیلپ پلیز.....''

''وعلیکم.....جی فرمایئے.....''

''آپ ایک فیمنس ہندوستانی کاؤنسلر ہیں۔ابھی تین دن پہلے جمعہ کے عرب نیوز اخبار میں آپ کا انٹرویو پڑھا۔میں آپ کے آفس نہیں آسکتی لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ میری مدد کرسکتے ہیں۔

میں ایک سعودی لڑکی ہوں۔آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔اگر یہ بات کسی کو بھی معلوم ہوگئی کہ میں ایک غیر ملکی سے.....

جی جی .....آپ ڈریئے نہیں .....یہ راز میرے سینے میں ہی رہے گا۔میں آپ کی مدد کرکے خوشی محسوس کروں گا۔''

''وعدہ.....''

''پکا وعدہ۔''

''آپ کی فیس؟''

''جو آپ کو مناسب لگے۔''

''پھر بھی۔''

''پہلے پرابلم بتایئے،اس کے حساب سے۔''

''ایک بار پھر وعدہ کیجئے،راز داری کا۔''

''واللہ،باللہ۔''

''میں آپ کے ملک کی زبان میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ مرتے دم تک آپ کا راز آپ کی امانت ہے اور امانت میں خیانت کرنا ایمان کی کمزوری ہے۔''

''اوکے،شکراً جزیلاً۔''

''اہلاً وسہلاً۔''میں نے اس کے تھینکس کا ویلکم میسیج کیا۔دن بھر خیالات کے بھنور میں دل ڈوبتا ابھرتا رہا۔

آج رات آٹھ بجتے ہی.....

''ایک بار اور وعدہ کیجئے۔''

''قسم اللہ۔''

''مجھے.....وہ مجھے.....ایک ہندی لڑکے سے عشق ہوگیا ہے۔''

میرے ہاتھ سے فون پھسل گیا اور آف ہوگیا۔

میں نے ایک بار پھر گہرائی سے سوچا اور فون کو ری اسٹارٹ کردیا۔

''کیا ہوا،آپ آف لائن۔''

''کچھ نہیں،آپ بتایئے۔''

میں 27 اگست کو مستشفی الفہد گئی تھی۔اس کی لکھاوٹ میں بے ترتیبی آنے لگی۔

''انہوں نے میری کلائی پکڑی اور میرے ابائے کے اوپر سے میری کمر پر اسٹیتھو اسکوپ لگا کر میرے دل کی دھڑکن سنی۔'' اس کے الفاظ ہانپ سے رہے تھے۔

''پھر..... میری گردن کے نیچے میرے ..... میرے ابائے کے گریبان .....'' اس کے الفاظ اس کے دل کے ساتھ دھڑکنے لگے۔

''اس ڈاکٹر نے آپ کے ساتھ برا.....یا کوئی غلط ارادہ.....؟''

''نہیں.....نہیں.....بات یہ ہے کہ میں نے زندگی میں پہلی بار بالکل ایسے ہی لڑکے کے لمس کو محسوس کیا ہے۔جس طرح کے لڑکے کا ذکر میری ماما نے اپنی ایک سہیلی سے فون پر کیا تھا،جب میں صرف چھ سال کی تھی۔ماما.....''

اس کے الفاظ میں اب آنسوؤں کی نمی اتر آئی۔

''لیلیٰ سعیدہ.....'' اس نے مجھے شب بخیر کہہ دیا۔

''گڈ نائٹ۔'' میں نے بھی جواب دیدیا۔اگلے دن رات تک میں اس کے میسیج کا انتظار کرتا رہا۔

115-A، پاکٹ A،ڈی ڈی اے فلیٹس،سکھدیو وہار،نئی دہلی
ruhi1970@yahoo.co.in
فون:09868969308

رات آٹھ بجتے ہی.....

''سلام''

''ماما کی شادی بابا سے ممبئی میں ہوئی تھی ۔ ماما ہندی فلمیں دیکھتی تھیں اور مسکراتی تھیں ۔ بابا کو ان کے مسکرانے پہ جنون چڑھ جاتا تھا۔لیکن ماما نے کبھی بابا کو جواب نہیں دیا۔بس فلمیں دیکھتیں اور بابا کے گھر آنے سے پہلے ویڈیو کیسٹ کو ڈرائینگ روم کی فالس سیلینگ کے اندر رکھ دیتیں اور دیر تک مسکراتی رہتیں۔'

''ماما ساری فلمیں ونود کھنہ کی دیکھتی تھیں۔''اس کی لکھاوٹ میں پہلی بارش کی جھنک بجنے لگی۔

اس کا فون آف ہو گیا۔اس کے میسیجز سے وہ نوخیز اور سنجیدہ ،لیکن معصوم بھی لگی اور اگر کہیں کوئی چال، کوئی فراڈ..... مجھے پھنسا کے..... مجھے واقعی گھبراہٹ سی ہونے لگی ۔اب میں کبھی اس کے میسیج کا جواب نہیں دوں گا۔ میں نے ان کمنگ کال بند کر دیں۔دیر رات میں نے فون آن کیا۔۔اسکے میسیج کی لائن لگی تھی.....

''میں کبھی آپ کو پریشان نہیں کروں گی..... پلیز .....پلیز.....''

''مجھے ان سے ملوا دیجئے.....''

''میں..... میں ان سے بات کرلوں؟''

''وہ.....بہت پیارے ہیں،بالکل رنبیر کپور۔۔''

''میں نے ان کا سیل نمبر دواؤں کے پرچے سے سیو کرلیا ہے۔''

میں ان کو میسیج کر دوں .....کہہ دوں کہ.....آئی لو یو.....''

''مجھے رات بھر نیند نہیں آتی.....نہ بھوک لگتی ہے۔ میرا دل دھم دھم دف کی طرح بجتا ہے۔میں ہر طرف ان کو دیکھتی ہوں۔''

''کیا وہ رنبیر کپور کی طرح مجھے اپنی بانہوں میں اٹھا کے.....

''مساء الخیر.....'' آپ مجھے کہہ دیجئے .....احلام جمیلہ''ایک اسمائیلی اور وہ آف لائن.....

اف.....اوہ.....!

یہ ہو نہ ہو کوئی سعودی پرنسز ہے۔پتہ نہیں کس بے چارے کی جان عذاب میں ڈال رہی ہے۔یہ تو بچ جائے گی ۔وہ بے چارہ..... جیل کی ہوا کھائے گا یا پھانسی.....خدا نہ کرے۔

مجھے آج نیند کم کم آئی ۔صبح سے شام تک اسی کا خیال دل و دماغ پہ بھاری پتھر سا رکھا رہا۔ابھی.....

آٹھ بجتے ہی۔

''السلام علیکم۔''

''آج دل اداس ہے ۔میں نے انہیں پہلا میسیج بھیجا۔انہوں نے جواب نہیں دیا۔میں نے ان کی ڈھیروں تعریفیں کیں۔وہ بہت ذہین اور شاندار ہیں۔ان پر گولڈن براؤن بلیزر بہت جچتا ہے۔وہ اپنے بالوں کو سر کے ہلکے سے جھٹکے سے اپنے ماتھے سے ہٹا دیتے ہیں۔ میری باتیں آپ کو بور کر رہی ہیں۔؟؟''

''نو.....نو..... بتائیے بتائیے۔''

''آپ کو بڑی مشکل سے تلاش کیا ہے۔میں اپنے دل کی باتیں کس سے کہوں ۔میری سب سے بڑی ماں سعودی ہیں وہ مجھے بہت پیار کرتی ہیں۔میری دوسری ماں سیرین ہیں۔ان کی چار بیٹیاں ہیں۔جو میری زبان نہیں جانتیں۔میری ماما سرخ وسفید رنگت کی تھیں اور میں کم سفید ہوں ۔بابا کو میرا رنگ اور میری باتیں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ماما سے بابا کا نکاح ممبئی میں کسی ایجنٹ نے کروادیا تھا۔میرے نانا اور نانی بہت غریب تھے۔میرے نانا کو کڈنی کی ضرورت تھی۔میری ماما نے اپنی مرضی سے میرے بابا سے نکاح کیا تھا۔۔جب کہ وہ ونود کھنہ جیسے لڑکے سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔پلیز سمجھئے.....''

''سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے میسیج کر دیا۔وہ طوفانی رفتار سے میسیج ٹائپ کرتی رہی۔

''ماما نے میری بڑی ماں سے کبھی جھگڑا نہیں کیا۔نہ ہی میری چھوٹی ماں سے۔وہ میرے بابا کا بے حد خیال رکھتی تھیں ۔بابا نے ماما سے شادی ان کے برٹش کا مپلیکیشن کی وجہ سے ہی کی تھی۔بابا بدو ہیں۔ایک دم ڈارک اور کرلی ہیر والے اور بابا کو اپنے رنگ سے نفرت ہے ۔میں ڈسکی کلر ہوں ۔ماما مجھے بہت پیار کرتی تھیں کیونکہ ان کو ڈسکی کلر سے خاص لگاؤ تھا۔بابا نے پیدا ہونے کے بعد مجھے کبھی اپنے سامنے نہیں بیٹھنے دیا۔میں کیا کروں اگر میں بابا کی مرضی سے وائٹش نہیں ہوں۔بابا جنونی ہیں۔ایک دن اچانک بابا آ گئے ۔ماما ونود کھنہ کی فلم دیکھ رہی تھیں ۔بابا نے ..... بابا ماما کے اوپر گرم قہوہ کا جرمن سلور پاٹ دے مارا اور ماما بے ہوش ہو گئیں ۔پھر ماما کو کبھی ہوش نہیں آیا۔'' وہ ضرور سسک رہی ہیں۔مجھے اپنا گلا چٹختا ہوا محسوس ہوا۔

''ماما نے مجھے اردو بولنا سکھایا۔پڑھنا مجھے نہیں آتا۔''

''آج مجھے بہت اہم کیس اسٹڈی کرنا ہے۔اب بائے۔'' میں نے اپنے دل میں اٹھی کسک کو بڑھنے سے روک دیا۔

میری نیندیں اڑنے لگیں۔اس کا خیال اب دل و دماغ پر چھانے لگا۔اب اس کے میسیج بولنے لگے ہیں۔ میرے چاروں طرف اس کی آنکھیں مسکراتی ہیں۔اس کے ہونٹ ، اس کے گالوں میں گڑھے ، اس کی پلکیں ، دانت ،اس کی گردن ،اس کی کمر ،اس کی باہیں،اس کا قد اور اس کے بال سب میرے اعصاب پر سوار ہو گئے۔

دل چاہا کہیں سے اس کا معشوق لا کے اس کے قدموں میں ڈال دوں ۔ واقعی وہ بہت مجبور ہے۔میں انتظار کرنے لگا اس کے میسیج کا اور .....میرا فون میسیج الرٹ ٹون بجانے لگا۔

''سلام ۔''

''.....میں آپ کو بھائی بلاؤں.....''

''پتہ نہیں۔'' شاید میں.....میں اسے بہن نہیں سمجھ سکتا۔

''اچھا.....نہیں.....'' بڑے شوخ انداز میں اسمائیل پر اسمائیل بھیجتی چلی گئی .....''ہائے .....کیا لگ رہے تھے.....اوہ..... سچی میں ..... بالکل میرے ہیرو۔ میرے رنبیر کپور۔''

''ملاقات ہوئی۔'' میرا دل واقعی زور سے اچھلا۔

'' اررے .....نہیں .....فوٹو میں ۔ ہا۔ہا۔ہا میں نے ان کے آفس کی ویب سائٹ سے ان کے انگنت فوٹو اپنے فون میں سیو کر لیے ہیں۔''

میرا جی چاہا کہ میں اس کو زور سے ایک ڈانٹ پلاؤں۔میں نے میسیج مٹایا نہیں لیکن۔

''ان کے فوٹو کو میں نے فوٹو شاپ میں جا کر اپنے فوٹو سے جوڑ دیا ہے۔میری اور ان کی جوڑی ۔نمبر ون جوڑی.....''

''ان کا قد زیادہ لمبا نہیں ہے۔ان کی آنکھیں زیادہ بڑی نہیں ہیں ۔ان کے بال زیادہ گھنے بھی نہیں ہیں۔ان کا رنگ زیادہ گورا نہیں ہے اور ان کے ہونٹ .....ان کی مونچھیں..... بالکل چارلی چیپلن۔ہاہاہا۔''

میں نے اپنے فون کو ہاتھ میں لئے لئے سامنے لگے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔میں اس کے محبوب سے کافی ملتا جلتا ہوں ۔میں اسمارٹ ہوں بلکہ خوبصورت بھی ہوں ۔کیا پتہ..... یہ لڑکی مجھے ہی ان ڈائرکٹ کہتی ہے یہ

سب باتیں.....میں دل میں مسکرا اٹھا۔

میں نے صبح اٹھتے ہی فون آن کیا۔اس کی ڈی پی .....اررے آج کیا بات ہے۔؟

اس کی آنکھوں کے نیچے سرخ کارنیشن پھولوں کا گلدستہ اوراس کی آنکھیں پوری طرح بے باکانا مسکرا رہی تھیں۔

''سلام''اس کے میسج آنے شروع ہوگئے۔

'' میں فلاور شاپ پر گئی تھی ۔وہاں وہ آئے تھے.....''

میرا دل بیٹھنے سا لگا۔

''وہ یہ پھول خرید رہے تھے ۔پھول انہوں نے چھوکر دیکھے۔ میں نقاب میں تھی۔وہ نہیں جان پائے کہ میں وہی ہوں جوان کے لئے جان دینے کو تیار ہے۔میں نے ان سے پوچھ کے یہ بوکے لے لیا۔اور نقاب کے اندر سے ہی اپنی آنکھوں سے لگایا اوراپنے ہونٹوں سے بھی اوراپنے دل سے بھی.....ان پھولوں میں ان کے لمس کی گرمی اور ان کی سانسوں کی مہک اور ان کی دھڑکنوں کی آہٹیں.....اور ہاں میں یہ سارے پھول سکھانے کے لئے اپنی ڈائری میں رکھ لوں گی،ان کی مہک ان پھولوں میں ہمیشہ کے لئے جذب۔''

میں نے فون آف کردیا۔ایک ماہ سے اب میں تھکنے لگا ہوں ایک ہی بات روز روز ۔لیکن صبح ہوتے ہی سب سے پہلے اس کا نمبر چیک ضرور کرتا ہوں۔

آج پھر ڈی پی بدل گئی ہے ۔ روتی ہوئی آنکھیں۔آنسوابل رہے ہیں۔اف.....کیا ہوگیا ہے اس پاگل کو۔

میں نے میسج کردیا''پلیز ہٹا دیجئے یہ ڈی پی.....''

مجھے غصہ آگیا۔

''کیوں؟'' یقیناً وہ اٹھلائی۔

''برا لگتا ہے۔''

''آپ کو کیوں .....؟؟''ان کو کیوں نہیں لگتا میرا رونا برا۔وہ کیوں نہیں سمجھتے۔کیوں نہیں ملتے۔''

''مجھے کیا معلوم'' میں نے فون زور سے بستر پر دے مارا۔دل چاہا جتنا غصہ کرسکتا ہوں اس پر کرلوں ۔لیکن ۔۔وہ میری کلائنٹ ہے محبوبہ نہیں ۔میں نے نیٹ آف کردیا۔لیکن دل بے چین رہا۔

رات آٹھ بجتے ہی''میں نے انہیں آن لائن نیوی بلیو شرٹ پریزنٹ کی۔وہ وہی پہن کے آئے تھے۔میں نے کہا تھا نہ میں ان سے کچھ نہیں مانگوں گی۔کوئی بھی فیور نہیں۔کوئی بھی فیوچر نہیں۔انہوں نے مجھ سے بس ایک بات کہی۔انہوں نے کہا کہ آپ میری بہت قدر کیجئے گا۔ میں اپنے آپ سے بہت محبت کرتا ہوں۔''

''میں ان کی اپنی جان سے زیادہ بے انتہا قدر کروں گی۔وہ ایک نہ ایک دن مجھ سے ضرور محبت کریں گے۔آپ بتایئے۔ان کو مجھ جیسی عورت اچھی لگتی ہوگی نا.....وہ مجھ سے پیار کرنے لگے ہیں نا؟؟''

آج اس کی ڈی پی بہت رومانٹک ہے۔گوری بھری بھری کلائیوں میں نازک سونے کی چوڑیاں۔کالی مہندی لگے انگلیوں کے پوراور نقش ونگار بنی ہتھیلیوں کے کشکول میں سفید موتیا کی کلیاں۔

'' وہ اس سے مل آئی۔؟؟'' میرے ہاتھ کی انگلیاں اس بے پناہ گرمی میں بھی سن ہوگئیں۔میں نے سن انگلیاں فون پر چلائیں۔

'جی،شاید۔''

''وہ مجھے دیکھتے رہ گئے۔میں بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔میں نے اپنا چہرہ کالے نقاب سے خود ہی کھول دیا۔ایک انڈین فلم میں اوم پوری نے کہا تھا،زندگی میں ہر انسان کو ایک بار محبت ضرور کرنی چاہئے ،محبت انسان کو بہت خوبصورت بنا دیتی ہے۔وہ پہلے سے بہت زیادہ خوبرو ہوگئے ہیں۔انہوں نے مجھے چھونے کی کوشش کی لیکن ان کے ہاتھوں میں ایک ارتعاش تھا۔آپ کو معلوم ہے نا.....محبت میں ایک دوسرے کو چھونے کی خواہش تو بہت گہری ہوتی ہے۔لیکن ایک دوسرے کو چھوتے ہوئے ایک کپ کپی ہوتی ہے ۔''

''وہ پیپی پرنس ہیں،کہہ رہے تھے زندگی بہت حسین ہے .....اب انہیں کیا بتاؤں کہ سب کی زندگی حسین نہیں ہوتی۔خیر آج کا دن بے حد حسین ہے۔''

''وہ اور میں شہر سے دور ریگستان میں روڈ سائڈ ملے۔ریت کے اونچے ٹیلوں کے پاس۔چاند کی ٹھنڈی چاندنی اورانکا چہرہ۔کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچہ تیرا۔اس نے کہا یہ چاند ہے۔میں نے کہا چہرہ تیرا''وہ بے خودی میں گانے لگی شاید۔

''میں نے ان کا نام.....وہ رکھا ہے.....وہ ہی جو ماما مجھے کہتی تھیں۔بتایئے؟''

نو آئیڈیا۔''

''چندا۔''

''وہ ہیں ہی چاند سے زیادہ حسین اور جان سے زیادہ پیارے.....اوہ.....''اس کی تحریر یک لخط مجسم عشق بن گئی۔

''دیکھا آپنے؟''

''نہیں اب تک نہیں۔آپ کو میں کہاں نظر آتا ہوں۔؟؟''میں نے اپنے ڈوبتے دل کو بہلایا۔

''پلیز۔نو مذاق۔''''آئی مین .....آپ نے دیکھا میرا عشق صوفیانہ!!

''وہ.....مجھ سے.....پیار.....کرتے ہیں.....؟؟''

''جی بہت.....بہت،بہت۔''

''ہا ہا ہاہاہاہاہا.....''اس کے میسج ہنستے رہے۔

''اررے یہ میرا خواب ہے جو میں روز سوتے جاگتے دیکھتی ہوں۔''

میرے سینے میں اٹکی ہوئی سانس ایک جھٹکے سے نکلی میں دھم سے پاس رکھی ہوئی میز پر ٹک گیا۔

''وہ اب میرا کہا مان رہے ہیں۔رات انہوں نے مجھ سے تنہائی میں ملنے کے لئے کہا۔لیکن میری ایک ہی شرط ہے۔جب تک وہ مجھ سے محبت نہیں کریں گے،میں نہیں جاؤں گی ان کے ساتھ اکیلے میں۔''

''پیار میں کیا دنیا داری۔عشق میں کیسی مجبوری۔''

میں نے اس کو ٹوٹولنا چاہا۔

''اگر انہوں نے مجھے چھولیا اور پھر مجھے بھول گئے۔''

''لیکن آپ کو تو ان سے شادی نہیں کرنی۔آپ کا عشق صوفیانہ،بلا شرط اور بے غرض ہے۔''وہ واقعی شریف لڑکی ہے۔کہیں یہ لڑکا اس کے ساتھ کھیل نہ کر رہا ہو۔مجھے ڈر لگا۔

''تو کیا بغیر محبت کے.....'' میں کیا سمجھاؤں۔وہ کچھ سمجھنے کے لئے تیار ہی نہیں۔

''میں نے ان کو لاسانی' ریسٹورینٹ میں ڈنر پر انوائٹ کیا ہے۔وہ آئیں گے نا۔؟''

''ہاں.....ضرور.....''کہا تو میں نے لیکن دل میں کچھ کھٹکا سا ہوا.....میں نے بجھے دل سے لکھ دیا۔

''میں ان سے کہوں گی کہ اقرار کریں میری محبت کا.....''

''اگر ان کو محبت ہوگئی تو.....''میرے دل نے خدشہ ظاہر کیا۔

''تو میں ان کے ساتھ جاؤں گی۔'' مجھے اپنی کرسی

زلزلے کی زد میں محسوس ہونے لگی۔ میں نے زور سے اپنے پیر فرش پر جما لئے۔

''اچھا.....آپ مرد ہیں بتایئے وہ ایک بار مل کے مجھے بھول گئے تو.....''

''آپ انہیں نہ بھولئے گا۔عشق تو آپ کو ہے نہ کہ انہیں۔''میں اب اسپیڈ میں میسیج ٹائپ کرنے لگا ہوں۔

''مجھے ان سے ملنا ہے اکیلے میں۔ لیکن بہت رسکی ہے۔''

او کے.....کب ملنا ہے؟'' میرے الفاظ کی اسپیلینگ غلط ہونے لگی۔

''آج شام سات بجے۔بابا نے دیکھ لیا تو؟ اگر کوئی پریشانی ہوگئی تو؟ آپ مجھے بچا لیجئے گا۔''

''ابائے میں بابا کو کیا معلوم۔'' مجھے جھنجھلاہٹ ہونے لگی لیکن ڈر بھی لگا۔

''پتہ نہیں کیسے بابا ہم سب گھروں کی عورتوں کو ابائے میں پہچان لیتے ہیں۔''

میں اپنے ڈرائیور کے ساتھ الشعلہ مال آتی ہوں۔آپ باہر ہی رک جایئے گا۔''

''آپ مجھے کیسے پہچانیں گی۔؟'' میں نے بچنے کی آخری کوشش کی۔

''میں نے آپ کا فوٹو دیکھا ہے۔عرب نیوز پیپر میں۔''

''اوہ! ٹھیک ہے۔''

شام 6 بجے ہی میں الشعلہ کامپلیکس کے گیٹ نمبر ایک پر تھا۔ ہر آنے جانے والی کو دیکھتا رہا۔ وہ نہیں ملی۔ نہ ہی اس کا کوئی میسج آیا۔ میں دو گھنٹہ وہاں کھڑا رہا۔ پھر گھر چلا آیا۔ میرا دل انجانے خدشات سے ڈوبنے لگا۔ اس کی ڈی پی بار بار دیکھتا رہا۔

بالوں میں چھپی ان کی آنکھیں اور انگلیوں سے جھانکتے اس کے ہونٹ، اوپر والے ہونٹ کے خم کے بیچ و بیچ کا لاموٹا سا خوبصورت ابھرا ہوا تل، کمان دار ابرو اور ٹھوڑی کی نوک.....

نہ جانے وہ اس کے ساتھ۔

دل کو بہلانے کے لئے میں اونچی آواز میں گانے لگا۔

شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

میرے کمرے کی کھڑکی سے باہر موسم کتنا گرم ہے لو چل رہی ہے اور گرم ریت کے بگولے اڑ رہے ہیں۔

رات کو تین بجے میں نے اس کا واٹس ایپ چیک کیا۔اس کی ڈی پی کی جگہ خالی تھی۔

میرے ڈوبتے دل نے یقین کر لیا کہ
وہ ضرور آج اس سے مل چکی ہے تنہائی میں۔

ایک دن .....دو دن.....تین دن.....میں پاگل ہونے لگا ہوں۔ چار دن..... پانچ دن..... چھ دن..... دس دن..... پندرہ دن.....اس کا فون آف ہے۔

''جواب دیجئے۔جج صاحب آپ سے آخری سوال کر رہے ہیں۔'' سرکاری وکیل میرا بازو پکڑ کر ہلا رہا ہے۔''آپ کو اپنی صفائی میں کچھ اور کہنا ہے۔'' جج نے مجھ سے سوال کیا۔

''جی.....جی جج صاحب میں اپنا گناہ قبول کرتا ہوں اور جلد سے جلد اپنے گھر واپس جانا چاہتا ہوں۔'' مجھے یہ آخری رات اپنے گھر میں گزارنے کی اجازت دے دیجئے جج صاحب۔''

''ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق یہ مرد ایک نفسیاتی بیماری کا شکار ہے۔کسی بھی مکمل ابائے سے ڈھکی خاتون کا نقاب الٹ دیتا ہے۔ایک نظر اس خاتون کے چہرے پر پڑتے ہی زور سے چیختا ہے اور بھاگنے لگتا ہے۔اتنا بھاگتا ہے کہ بیہوش ہو کر گر جاتا ہے اور ہوش آنے پہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔یہ شخص اپنی غلطیوں کو مانتا ہے۔اس لئے عدالت مسٹر محمد علی پارکر ولد محمد نوشاد علی پارکر کو باعزت بری کرتی ہے اور ہمیشہ کے لئے اس کو اس کے ملک ہندوستان بھیجنے کا حکم دیتی ہے''۔

میری آخری خواہش پر مجھے اس رات اپنے گھر رہنے کی اجازت مل گئی۔اپنے کمرے میں، اپنے بیڈ، اپنی کرسی، اپنی ٹیبل اور اپنے ٹیبل لیمپ کو چھو کر دیکھ رہا ہوں۔آخری بار ..... ہر جگہ سے اس کے میسیجز کی ٹون سنائی دے رہی ہے۔نیند اب دو ماہ سے آئی ہی نہیں۔اس کی باتیں اور اس کے میسیج دماغ میں گھوم رہے ہیں۔صبح ایک پل میں ہوگئی۔آخری رات گزر گئی۔ابھی چار گھنٹے بعد میری ممبئی کے لئے فلائٹ ہے۔

میری کمپنی کا وکیل میرا پاسپورٹ اور ضروری کاغذات لئے میرے بازو سے اپنا بازو لگائے مجھے ایک طرح سے قید کئے ہوئے ہے۔ہم کنگ خالد انٹرنیشنل ایئرپورٹ کے ڈپارچر لاؤنج میں داخل ہو چکے ہیں۔میں اپنی نظریں زمین میں گاڑے چل رہا ہوں۔۔مجھے صرف میسیج ٹون سنائی دے رہی ہے۔میری آنکھوں میں تیر آئے اس کے ترشے ہوئے ہونٹوں کے خم کے درمیان ابھرا کالا موٹا تل بتا رہا ہے کہ وہ اپنے معشوق کی بے وفائی برداشت نہیں کر سکی۔وہ.....مر گئی.....نہیں.....وہ مر نہیں سکتی۔

اس کے میسیج کی ٹون.....میں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔میری آنکھوں میں دھواں سا بھرنے لگا۔مجھے ٹھوکر لگی اور میں گرتے گرتے سنبھلا۔میں نے جلدی سے سوری کہنے کے لئے اپنی اندھی ہوتی ہوئی آنکھیں اٹھائیں اور میں نے اپنے پورے ہوش و ہواس میں ٹرالی پکڑے ہوئے دستانے سے ڈھکے نازک ہاتھوں سے اوپر دیکھا.....میری اندھی آنکھیں دیکھنے لگیں.....میں نے مکمل ابائے میں ڈھکی خاتون کا نقاب کھینچ لیا اور ایرپورٹ کے ایکزٹ گیٹ کی طرف دوڑ لگا دی۔

میں پھر اسی جیل میں خطرناک قیدیوں والے کریمنل سیل میں بند ہوں۔آہنی سلاخوں کے سامنے شرطی مجھے زور سے ''انت مجنوں'' کہہ کے چھیڑ رہا ہے اور مسکرا رہا ہے۔

لیکن.....اس بار میں نے جان بوجھ کے یہ نازیبا حرکت کی ہے، کیونکہ میں.....

اپنی ہم سخن کو تلاش کئے بغیر اس ملک سے واپس نہیں جا سکتا۔

☆☆☆

ضروری اطلاع

اب اعزازیہ کی رقم ای سی ایس (ECS) کے ذریعے بینک کھاتے میں بھیجی جاتی ہے چیک سسٹم ختم ہو چکا ہے۔آپ کی تخلیق 'آجکل' کے جس شمارہ میں شامل ہوئی ہے وہ شمارہ ملتے ہی ہمیں اپنی بینک کھاتے کی ڈیٹیل یعنی پاس بک کے صفحہ اول کی فوٹو کاپی یا کینسل چیک کی کاپی اور پین کارڈ کی کاپی فوری طور پر ای میل کریں یا ڈاک سے بھیجیں۔مطلوبہ چیزیں دس پندرہ دنوں کے اندر اندر ہمیں موصول ہو جانی چاہئیں۔بروقت موصول نہ ہونے کی صورت میں اعزازیہ کی رقم آپ کے کھاتے میں نہیں پہنچ پائے گی۔(ادارہ)

غزلیں

پروفیسر آصفہ زمانی

کھل اٹھے زخم دل کے رت آئی جب خزاں کی
ہے فصلِ گل تو بے شک محتاج گلستاں کی

کیوں زندگی کا رونا روتے ہو تم ہمیشہ
قدر اس کی کرتے رہنا نعمت ہے یہ جہاں کی

پروانے ہو اگر تم جل کر بھی تو دکھاؤ
ایسا نہ کرسکے تو مر دانگی کہاں کی

جاذب نظر ہو کتنے یہ میرے دل سے پوچھو
حیرت میں آئینہ ہے، ہے یہ کشش کہاں کی؟

اے آصفہ اکیلی میں رہ گئی جہاں میں
مجھ میں نہیں ہے قوت اب صبرو امتحاں کی

A-4/83، وشال کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ۔226010
فون: 09621914069

عذرا نقوی

میں تیری یاد کے مانوس سے حصار میں ہوں
کہ اب بھی جیسے کہیں تیرے اختیار میں ہوں
ہر اک برس جو گزرتا ہے ایسا لگتا ہے
میں جانے والے ہر اک موسم بہار میں ہوں
ہر ایک سمت اجالے ہیں نور سا کیا ہے
میں کائنات کے کس اجنبی مدار میں ہوں
یہ جانتی ہوں کوئی معجزہ نہیں ہوگا
دعا کو ہاتھ اٹھائے کس انتظار میں ہوں
کہاں سے آ گئی یادوں کی گم شدہ اک شام
میں خوشبوؤں کی عجب نرم سی پھوار میں ہوں
بہت دنوں سے کسی نظم نے پکارا نہیں
کسی خیال کی دستک کے انتظار میں ہوں
یہ خودکلامی ہے یا شاعری نہیں معلوم
بس ایسا لگتا ہے لفظوں کے آبشار میں ہوں

ٹاور 11، فلیٹ ۔502، گریٹر نوئیڈا، سیکٹر Pi-2،
گوتم بدھ نگر فون: 9958933161

کوثر جہاں

شکست خوردہ ہی گزرے تو زندگی کیا ہے
زوال سے نہیں اُبھرے تو آدمی کیا ہے

شب فراق میں کھلتے ہیں رمز ہستی کے
یہ اہلِ دل کو خبر ہے کہ آگہی کیا ہے

وجودِ ساقیٔ کوثر ہی خود سمندر ہے
اب اس روانی سے آگے بھی تشنگی کیا ہے

ہزار دعوے رکھیں ہم وفا پرستی کے
جو درد ہی نہیں دل میں تو بندگی کیا ہے

اُتر کے دل میں دکھا دے تمام ظلمت کو
جو آئینہ ہو نہ جائے وہ روشنی کیا ہے

کسی کے رو کے مسافر کبھی نہیں رکتا
سلگتے روز ہیں کیا شب کی برہمی کیا ہے

مرے وجود پہ کوثر ہے روشنی کی نگاہ
اب اس کے سامنے کوئی بھی تیرگی کیا ہے

معرفت فیاض رشک جمالپور، دلاور پور، مونگیر
munger786@gmail.com

خوشبو پروین

رباعیات

تہذیب وتمدن کو بچا کر رکھئے
گہوارۂ گلشن کو سجا کر رکھئے
رہزن نہ چرالے کہیں پھولوں کو یہاں
ہر آنکھ کو آئینہ بنا کر رکھئے

سر آنکھ پہ عزت سے بٹھانا ماں کو
ہر بات بہرحال بتانا ماں کو
قندیل محبت کی جلا کر رکھنا
ہرحال میں سینے سے لگانا ماں کو

پٹنہ ہو کہ لکھنؤ کہ دلّی کہ دکن
ہرسمت نظر آتا ہے اردو کا چلن
پامال نہیں ہوگا یہ اردو کا جہاں
گلزار ہوا جاتا ہے اردو کا چمن

صحرا سے محبت نہ گلستاں سے مجھے
پر مجھ کو محبت ہے مری ماں سے مجھے
آنگن نہیں چھوڑوں گی کبھی میں ان کا
ہرحال میں الفت ہے مری جاں سے مجھے

امید کوئی اور کوئی آس نہیں
جینے کا ارادہ ہے مگر سانس نہیں
اس طرح تو مرجائے گا تنہا خوشبو
''دل ڈوب رہا ہے کہ کوئی پاس نہیں''

صاحب گنج، الفتیا ٹولہ، چمپا نگر، یونیورسٹی بھاگلپور، بہار۔4
فون:8434279196

عالیہ

اُمید

حیف صد حیف!
اے روشن ضمیر!
تو ازل سے ہے یوں مصروفِ عمل
تیری نظروں میں سدا
آسمانوں سے پرے کی زندگی
اس زمیں کی گود میں سوئے بدن
تو نے اے روشن ضمیر
یہ بھی سوچا ہے کبھی؟
زندگی کی رات طولانی ہے کیوں؟
ظلمتِ شب میں کمی آتی نہیں
''بیضہ آسا تنگ بال و پر پہ ہے کنج قفس''
مردِ دانا دیر تک خنداں رہا!
اور دورِ مشرق کی طرف
اپنا رُخ کر کے کہا
یہ جو ہلکی سی نظر آتی ہے
روشنی کی اک کرن
یہ نئی صبح ہے
کل یہ سورج بن کے غالب آئے گی
اس اندھیری رات پر
رات کتنی ہی اندھیری ہو مگر
وہ سدا رہتی نہیں!

شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔7
فون:7503090927

شاذیہ عمیر

غزل

دل میں تڑپ اور آنکھ میں پانی دے مولا
میرے غم کو نئی روانی دے مولا

ساری عمر انجان ڈگر پر بیت گئی
دنیا اب جانی پہچانی دے مولا

کب تک میں بیکار کی باتیں رقم کروں
اب تو کوئی الگ کہانی دے مولا

تجھ سے روٹھوں تجھ سے دل کی بات کروں
اتنی تو مجھ کو من مانی دے مولا

دریا کی موجیں بھی جس پر رشک کریں
مجھ میں کچھ ایسی طغیانی دے مولا

شیو کی صورت قطرہ قطرہ وِش پی لوں
ہمت میں ایسی جولانی دے مولا

دنیا کی چاہت میں ڈوب گئی ہے شاذؔ
بے پروا دل، بے سامانی دے مولا

اسسٹنٹ پروفیسر ڈ شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔7
فون:09650618651

ڈاکٹر رضوانہ ارم

موسم طرب خیز

قطرۂ ابر کی نوازش
سرِ شام ہونے والی بارش
اور گیلی مٹی کی/ سوندھی سوندھی مہک
فضا میں/ گل افشانیاں سی کرنے لگی ہے
گل بُن کے پودے/ گلستاں کی رونق
بڑھانے لگے ہیں/ خوشی کے
نئے گیت گانے لگے ہیں
شاہراہیں سجل لگ رہی ہیں
گل تر سے آراستہ ہو رہی ہیں
سرمئی، ملگجے بادلوں کی ردائیں
چھٹنے لگی ہیں/ آسماں پر
آدھے سے تھوڑا زیادہ/ چاند کھلا ہے
مطلع دھلا ہے/ ستارے گل بوٹے
کھلانے لگے ہیں/ رات رانی کی خوشبوئیں
مشامِ جاں میں سمانے لگی ہیں
آم کی کیریوں/ سنبل و خس سے
روشیں اَٹی پڑی ہیں
آرزوؤں کا مسکن/ دل خوش گماں
خواہشوں کو بننے لگا ہے/ اور تمنا کا چاند
خوش رنگ سا ہو چلا ہے

صدر شعبۂ اردو، جمشید پور وومین کالج، جمشید پور
فون:08709865278

عمرانہ خانم

غزل

مجھ پہ کیا گزری ہے یہ تجھ کو بتاؤں کیسے
زخم کس کس نے دیئے ہیں وہ دکھاؤں کیسے

مجھ کو منزل کا پتہ بھی نہیں معلوم کہ اب
میں تجھے چھوڑ کے تنہا کہیں جاؤں کیسے

میں بھٹکتی رہی تپتے ہوئے صحراؤں میں
تھی پریشان میں گھر لوٹ کے جاؤں کیسے

تو ہی پتوار ہے تو ہی ہے کنارہ میرا
ناؤ کاغذ کی ہے اُس پار میں جاؤں کیسے

تیری یادوں کے جو پنچھی ہیں وہ مہماں مرے
شاخِ دل سے اُنہیں عمرانہ اُڑاؤں کیسے

500/22، فورتھ فلور، مڈل پورشن، فلیٹ
نمبر 402، ذاکر نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔25
فون:9911873183

استوتی اگروال

مسافر

میں ایک مسافر ہوں
چلنا میرا کام ہے
میں ہمیشہ چلتی ہی رہوں گی
خواہ راستے میں
کتنے ہی کانٹے آئیں
میرا راستہ کوئی نہیں روک سکتا
میرے پاؤں
لہولہان ہو جائیں
تیز آندھی ہو یا طوفان
مجھے چلتے ہی رہنا ہے
پتہ نہیں میری منزل کتنی دور ہے
لیکن،
میں کبھی نہیں ہاروں گی
ایک دن میں اپنی منزل تک
ضرور پہنچوں گی
کیونکہ میں ایک مسافر ہوں
چلنا میرا کام ہے

اگروال جیولرز، سرونج، مدھیہ پردیش
فون:09575089694

تبصرے

☆ تبصرے کیلئے کتاب کی دو کاپیاں لازماً ارسال کریں۔
☆ ضروری نہیں کہ ہر کتاب پر تبصرہ شائع ہو۔
☆ کتاب کے ساتھ تبصرہ ارسال نہ کریں۔
☆ تبصرے کے لیے تقاضا کر کے شرمندہ نہ کریں۔
☆ کتاب کسی بھی صورت میں واپس نہیں کی جائے گی۔

نام کتاب : بھولے بسرے مجاہدین

مصنف : نند کشور وکرم
ضخامت : 224 صفحات
قیمت : 300 روپے
ناشر : پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزر، الیف 14/21، کرشنا نگر، دہلی
مبصر : خالد اشرف
فون : 08800489012

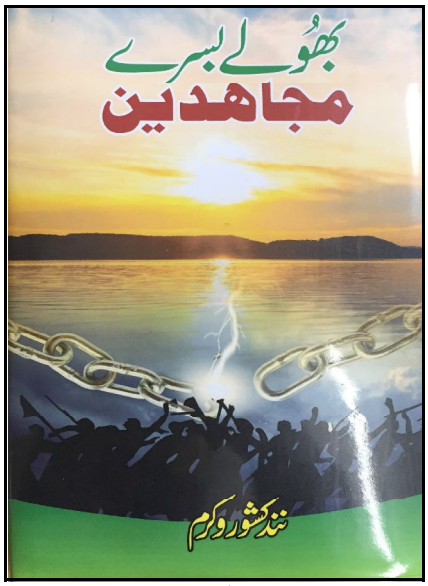

تاریخ ایک ایسا بحر اعظم ہے جس میں سیکڑوں دھارے ایک دوسرے سے متصادم اور متوازی چلتے رہتے ہیں۔اس لیے کہنا مشکل ہوتا ہے کہ کسی ملک یا معاشرے میں کس زمانے میں کون سا سیاسی دھارا زیادہ بسیط تھا اور کون سا محدود؟ اسی لیے ہندوستان کی تاریخ آزادی کے مختلف دھاروں کی باہم آویزش اور آمیزش کو سمجھنے کے لیے سب سے اول ان کی نوعیت کو سمجھنا ضروری ہے۔نند کشور وکرم نے زیر تبصرہ تازہ تصنیف بعنوان 'بھولے بسرے مجاہدین' کے ذریعے ہندوستانی تاریخ کے اس ملے جلے انقلابی دھارے کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے کیونکہ ان کے مشاہدات وسیع ہیں۔انہوں نے ہندوستان (اور پاکستان) میں بہت اہم تاریخی واقعات کا جاگتی آنکھوں سے نہ صرف جائزہ لیا ہے بلکہ ان میں شرکت بھی کی ہے۔

کتاب کے دیباچے میں نند کشور وکرم نے لکھا ہے کہ تقسیم کے بعد ہندوستان میں اکثر لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ ہندوستان کو آزادی (صرف) ہندوؤں کی کوشش سے حاصل ہوئی ہے حالانکہ اس میں مسلمانوں کا بھی اتنا ہی حصہ رہا ہے جتنا کہ ہندوؤں کا۔اسی لیے اگر ملک کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی کانگریس پر نظر ڈالی جائے تو بدرالدین طیب جی سے لے کر ابوالکلام آزاد تک دس صدور ایسے گزرے ہیں جو اقلیتی فرقے سے وابستہ تھے۔

چونکہ وکرم صاحب غیر منقسم پنجاب سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے، قدرتی طور پر ان کے ذہن و دل میں آج بھی جب کہ ان کی عمر 90 برس چھو رہی ہے، اپنے آبائی وطن کی تاریخ و تہذیب کے لیے محبت موجزن ہے۔اس لیے زیر تبصرہ خاکوں: ''بھولے بسرے مجاہدین'' میں انہوں نے ان انقلابیوں کی شخصیات پر خامہ فرسائی کی ہے، جنہوں نے اس خطے میں آزادی اور انقلاب کی شمع روشن کی تھی، اور جن کو دونوں ملکوں میں فراموش کر دیا گیا ہے۔

ان انقلابیوں میں سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں کے علاوہ ان کے بھائی ڈاکٹر خان، اجمل خٹک، میاں افتخار الدین، دادا امیر حیدر، اللہ بخش سومرو، حاجی ترنگ زئی، خوشحال خاں خٹک، شورش کاشمیری، عبدالرحیم پوپلزئی، عبیداللہ سندھی، عطاء اللہ شاہ بخاری، کامریڈ فیروز الدین منصور، باباغنی اور عوامی شاعر استاد زین خاں وغیرہ کے 46 خاکے باتصویر اس تاریخی تصنیف میں شامل ہیں۔

وکرم صاحب نے اپنی زندگی اور نظریۂ حیات کے بارے میں لکھا ہے کہ ''جہاں تک مذہب کا سوال ہے، میں ہندو دھرم میں پیدا ہونے کے باوجود اپنے آپ کو مذہب 'انسانیت' کا پیروکار مانتا ہوں۔میں فطرت کا بہت بڑا پرستار ہوں اور نیچر کو ہی خدا یا ایشور مانتا ہوں۔اسی لیے اس کتاب کے ایک ایک لفظ سے انسانیت اور سیکولرازم کی گونج سنائی دیتی ہے۔اس کتاب سے قاری کو اکثر ایسی اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں کہ وہ حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔مثلاً کہ شہید عبدالصمد خاں اچکزئی نے تقریباً تیس برس انگریزوں کی جیل میں گزارے تھے، لیکن 1973 میں پاکستان میں بمباری میں شہید ہو گئے۔اسی طرح چارسدّہ کے انقلابی حاجی حیات گل نے ہری پور جیل میں سیاسی قیدیوں کو ٹارچر کیے جانے کے خلاف ریکارڈ 65 دن بھوک ہڑتال کی تھی جب کہ جیتندر ناتھ نے لاہور جیل میں 63 دن بھوک ہڑتال کرنے کے بعد شہادت حاصل کی تھی۔اسی طرح 1922 کی ہندوستان چھوڑو تحریک کے دوران پشاور کی عدالت کے باہر پولیس کے لاٹھی چارج میں سیدا کبر شہید ہو گئے تھے۔ان کی غریب بیوہ کی مدد کرنے کے لیے عوام نے چندہ کیا، لیکن اس بہادر خاتون نے یہ کہہ کر یہ رقم لینے سے انکار کر دیا تھا کہ ان کے شوہر نے تحریک آزادی میں کسی انعام کی خاطر حصہ نہیں لیا تھا۔

غرض 'بھولے بسرے مجاہدین' ایک ایسی اہم کتاب ہے جس میں ہندوستانی انقلابیوں کے ایسے مرقعے نند کشور وکرم نے کھینچے ہیں، جن سے عام لوگ یکسر ناواقف ہیں۔اس کتاب کی تکمیل میں مجاہد آزادی انور خاں دیوانہ نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے، وہ پشاور سے لگاتار وکرم صاحب کو کتابیں اور اہم اطلاعات فراہم کرتے رہے اور وکرم صاحب کو یہ کتاب تصنیف کرنے کی تحریک دلاتے رہے۔

آخر میں کہا جا سکتا ہے کہ نند کشور وکرم نے ان بھولے بسرے انقلابیوں کی تاریخ لکھ کر نہ صرف ان شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے بلکہ اردو داں طبقے پر بھی بڑا احسان کیا ہے۔کاش اس کتاب کے دوسری زبانوں میں بھی ترجمے ہوں تاکہ ہماری عوام اپنی تاریخ کے ان عظیم کرداروں سے بخوبی واقف ہو سکیں۔

نام کتاب : بے کرانیاں

مصنف : پروین شیر
ضخامت : 184 صفحات
قیمت : 1200 روپے
ناشر : ادارہ نیا ادب (بنگلور)
مبصر : محمد نوشاد عالم ندوی
فون : 09015763829

'بے کرانیاں' محترمہ پروین شیر کی نظموں کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ پروین شیر اردو دنیا کے لیے محتاج تعارف نہیں

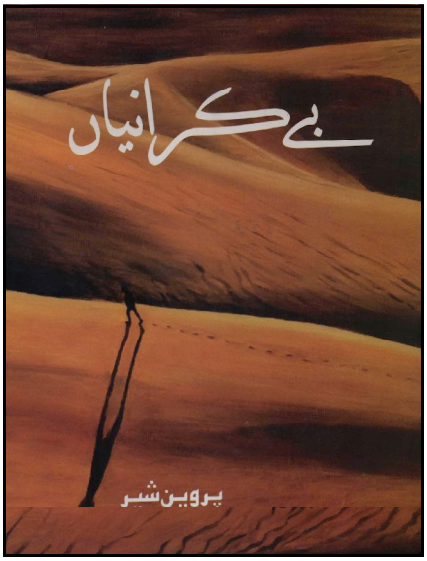

ہیں، وہ پٹنہ میں پیدا ہوئیں اور شادی کے بعد کناڈا منتقل ہوگئیں، اب وہ امریکہ میں ہیں۔ پروین شیر کا شمار ان فن کاروں میں کیا جاتا جو اپنی جواں سالی میں ہی بہ سلسلہ روزگار بیرونی ممالک جانے کے باوجود اردو زبان کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ پروین شیر کو محض 16 برس میں ہی وطن عزیز کو خیر باد کہنا پڑا۔ سب سے پہلے تو میں یہی عرض کرنا چاہوں گا کہ پروین شیر کی شعری زبان پوری طرح اردو تہذیب وثقافت میں رچی بسی ہے۔ گویا وہ اپنی عمر کے ابتدائی زمانوں میں جو اردو زبان سیکھی تھی اور اپنے خاندان کے ادیبوں کی محبتوں میں جو شعور پروان چڑھا تھا اسے مسلسل قدیم وجدید اردو ادب کے مطالعے سے جلا بخشتی رہیں۔ ان کی نظموں کی زبان میں پختہ کاری اور صلابت کا احساس ہوتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ 'بے کرانیاں' ہی ان کا تمام سرمایہ سخن ہے۔ اس سے قبل 'کرچیاں' اور 'نہالِ دل پر سحاب' جیسے شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں، اور یہ دونوں 'بے کرانیاں' ہی کی طرح ذولسانی (یعنی اردو اور انگریزی) ہیں اور انھوں نے اپنی نظموں کے تاثرات کو خود اپنی پینٹنگز سے بھی آراستہ کرکے دوآتشہ کردیا ہے۔ 'نہال دل پر سحاب جیسے' ان کی ماں کی موت پر لکھی ہوئی نظموں کا مجموعہ ہے جو اردو شاعری کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ ہے۔ پروین شیر کی نظموں کی ایک خاص خوبی جو میری نظر میں ہے وہ اس کا دھیما آہنگ ہے۔ انھوں نے انسانیت کے اندوہ ناک تجربات اور تضادات کو جو شعری زبان دی ہے، اس میں درد مندی بھی ہے، غصہ بھی ہے اور احتجاج بھی۔ وہ شکوہ بھی کرتی ہیں، تاسف کا اظہار بھی کرتی ہیں لیکن ان تمام قسم کے جذبات کو انھوں نے بے حد مہذب لب و لہجے میں ادا کیا ہے۔ پروین شیر خواہ گلہ گزاری کریں یا احتجاج وہ ایک خاص حد سے تجاوز نہیں کرتیں۔ میں یہاں ان کی نظم قوت کی مثال دینا چاہتا ہوں۔ یہ ایک عجیب وغریب نظم ہے، پہلی نظر میں اس کی علامتی تہہ داری ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اس کے بعد اور کئی سوال اس سے برآمد ہوتے ہیں:

چمچماتی دور تک جاتی ہوئی پختہ سڑک اور
اس کے وزنی پاؤں کے نیچے دبی
روئیدگی کی بے بسی/ بے حد گھٹن
تاریکیاں/ رستے معطل
رک نہیں سکتے مگر یہ حوصلے اب
درد آگیں قوتوں کی دھار نے چیرا ہے پتھر
ہر طرف پھیلیں دراڑیں
پتھروں کی ہر شگاف رگ سے
رستا جارہا ہے بھربھری مٹی کا تازہ خون
جیسے پھوٹ کر پھر سے نکل آئے ہوں
پچھلے دور کے زخموں کے انکر !!

نظم مایوسی سے شروع ہوتی ہے جس میں ایک احتجاج کی لے بھی شامل ہے کہ انسان اپنی سہولتوں پر فطرت کو قربان کرتا جارہا ہے پھر بھی فطرت کی اپنی طاقت ہے وہ خود بخود اپنا راستہ بنالیتی ہے۔ انسان زمین کو چھید رہا ہے، اسے چھلنی چھلنی کررہا ہے، اس پر پختہ تر سڑکیں بنا رہا ہے۔ محلات کھڑا کررہا ہے، گویا فطرت سے اس کی روئیدگی اور قوت نمو پر ڈاکہ ڈالنے سے باز نہیں آرہا ہے، تاہم کبھی وہ یک بہ یک چشمے کی مانند پھوٹ نکلتی ہے کبھی رنگارنگ پودوں، پھولوں کی شکل میں اپنی پنہاں صورتوں کو آشکار کرتی ہے۔

پروین شیر کی زیادہ تر نظموں میں امید وناامیدی، قنوط اور رجا کے درمیان کشمکش دکھائی دیتی ہے۔ یہی چیز آخری موڑ پر، سیڑھیاں، بے کراں، وہاں یہاں، عجلت پرواز وغیرہ جیسی نظموں سے عیاں ہے۔

پروین شیر ایک منفرد شاعرہ ہیں، انھوں نے عورت اور مرد کو دو الگ الگ خانوں میں رکھ کر نہیں دیکھا ہے جیسا کہ ہماری بیشتر شاعرات کا رجحان ہے۔ انھوں نے ساری انسانیت کو ایک اکائی کے طور پر دیکھا ہے، جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

پروین شیر کی کئی نظموں میں چاہے وہ زندگی اور موت کے ازلی اور ابدی سوالوں میں الجھی ہوئی ہوں، چاہے اپنی ذاتی زندگی کے تجربوں سے دوچار ہوں، ان کا رومانی اور شاعرانہ انداز حاوی رہتا ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں جس طرح کی نظمیں شامل کی ہیں اور جس انداز میں مصوری کے ساتھ کتاب کی زینت کو دوبالا کیا ہے وہ اس کتاب کی مقبولیت کا ضامن ہے۔

کتاب دیدہ زیب ہے، ظاہر اور باطن خوبصورتی کا پیکر ہے۔ اردو میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ ہے، جس کا آغاز پروین شیر نے کیا ہے۔ اس کتاب کی دیدہ زیبی سے یہ بھی احساس ہوا کہ اردو اشاعتی اداروں نے پرنٹنگ اور پیش کش میں کافی ترقی کی ہے۔

نام کتاب : ہم تم دوست ہوئے

مصنف : منصور صفدر نقوی

قیمت : 200 روپے

ناشر : مکتبہ نونہال وسادات امروہہ آرگنائزیشن، دہلی

مبصر : علی ظہیر نقوی

فون : 09968168766

بچوں کی اخلاقی تربیت کے حوالے سے اردو ادب میں بچوں کے لیے یوں تو بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن سائنس اور ماحولیاتی سائنس کے حوالے سے بچوں کے ادب پر جتنا کام ہونا چاہئے تھا ابھی نہیں ہوا ہے جب کہ عصر حاضر میں اس طرح کے لٹریچر کی بچوں کو اشد ضرورت ہے۔

شفیق میموریل اسکول کے سابق استاذ و ماہر تعلیم صفدر عباس نقوی (مرحوم) نے 1950 میں مکتبہ 'نونہال' قائم کیا تھا جس کے تحت انہوں نے بچوں کے ادب پر اپنی تحریر کردہ اچھی تصانیف پیش کی تھیں۔ منصور صفدر نقوی انہی کے لائق فرزند ہیں۔ گزشتہ 30 سالوں سے وہ فلم اور ٹیلی ویژن کی دنیا سے وابستہ رہ کر ماس میڈیا کے طلبہ کے لیے درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لیے کامیاب ٹی وی سیریل، ڈاکومینٹری فلمیں اور کہانیوں کے اسکرپٹ تحریر کیے ہیں۔

منصور صفدر نقوی کی ماحولیات کے تحفظ کے حوالے سے بچوں کے ادب پر زیر نظر اہم کتاب ''ہم تم دوست ہوئے'' حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اپنے موضوع پر اس اہم کتاب کو آرٹ پیپر پر باتصویر شائع کیا گیا ہے۔ کتاب کا ٹائٹل چہار رنگی ہونے کے ساتھ جاذب نظر ہے۔ اس کتاب کو حسن بن علی نے مرتب کیا ہے۔

کتاب ''ہم تم دوست ہوئے'' کی کہانی میں مصنف نے انتہائی خوبصورت پیرائے میں بتایا ہے کہ پیڑ پودوں کا وجود انسانی زندگی کے لیے کیوں ضروری ہے۔ پیڑ پودے انسانوں کو آکسیجن کے ساتھ انسانی زندگی کے لیے دوسری کیا کیا اشیا فراہم کرتے ہیں، ان کا تحفظ ہمارے لیے کیوں ضروری ہے۔ مصنف نے اپنی کہانی کے اس تھیم کو اپنی کتاب میں خوبصورت انداز و اسلوب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کہانی کے کردار جو 9 سال سے 12 سال تک کی عمر کے بچے ہیں، کھیل کھیل میں ماحولیات کے تحفظ کے حوالے سے نصیحت حاصل کر لیتے ہیں۔

اس کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے لکھا ہے:

''ہم تم دوست ہوئے'' آج کے اہم ترین موضوع ماحولیات کا تحفظ کے تحت تحریر کردہ کہانی ہے۔ دلچسپ پیرائے میں طالب علموں کو سائنسی تعلیم کے ساتھ ساتھ پیڑ پودوں سے ہمدردی اور انہیں دوست بنانے کی ترغیب دینے والی ایک بے حد اہم کہانی ہے۔ باتصویر کہانی میں مصنف نے عقلی دلائل کے ساتھ بچوں کو سائنس کی ایسی تعلیم دی ہے جو ہمیشہ ان کے ذہن پر نقش رہے گی۔''

وہ پیڑ پودوں سے متعلق ماحولیاتی سائنس کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کہانی میں ماحولیات کے تعلق سے بچوں کی صالح تربیت کا بخوبی فریضہ انجام دیا گیا ہے۔ اس کہانی کے ذریعہ پیڑ پودوں کی زندگی سے متعلق بچوں کے معصوم سوال اور کہانی کا ربط و تسلسل قاری کی دلچسپی و تجسس میں اضافہ کرتے ہیں اور سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ پیڑ پودوں کے ساتھ ہمارا رویہ کیسا ہونا چاہئے۔

زیر تبصرہ کتاب ماحولیاتی سائنس کے حوالے سے بچوں کے ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے موضوعات پر بچوں کے لیے مزید تحریریں سامنے آئیں تاکہ ماحولیات کے متعلق بیداری میں مزید اضافہ ہو سکے۔ مصنف نے اپنی اس کاوش کے ذریعے جو پیغام دینا چاہا ہے اس میں وہ کامیاب ہیں۔

کتاب کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس کہانی کے مسودہ پر بچوں کے ادبی ٹرسٹ نے انجمن ترقی ہند دہلی کے زیر اہتمام 2018 میں منعقد ہونے والے انعامی مقابلہ میں پہلے انعام کا مستحق قرار دیا ہے۔

نام رسالہ :نیا دور: مجتبیٰ حسین نمبر

ضخامت : 80 روپے
قیمت : 15 روپے
ناشر : محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، 6 پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ
مبصر : ڈاکٹر فیروز عالم
فون : 09908201880

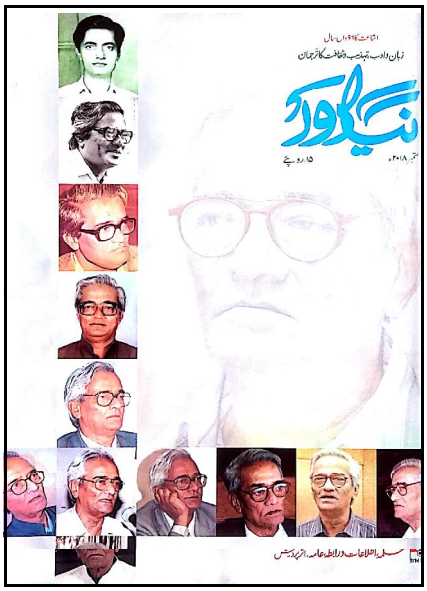

مجتبیٰ حسین کا شمار صف اول کے مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اردو طنز و مزاح کی جو گراں قدر خدمت کی ہے اس کا معترف ایک زمانہ ہے۔ انشائیہ، خاکہ، کالم اور سفر نامہ ہر صنف میں انھوں نے اپنی جدت و انفرادیت کے گل بوٹے کھلائے ہیں۔

''نیا دور'' کا زیر نظر شمارہ چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ ''عجز و انکسار کا پیکر مجتبیٰ حسین'' کے زیر عنوان مجتبیٰ حسین سے سہیل وحید کی ایک طویل گفتگو پر مبنی ہے جس سے ان کی شخصیت، مزاج، حالات، عہد، مزاح نگاری، عصر حاضر میں طنز و مزاح کی صورت حال، حیدرآباد اور دہلی میں ان کا قیام، ان کے دوستوں اور ان شخصیات کے بارے میں واقفیت حاصل ہوتی ہے جن سے وہ متاثر ہوئے۔ دوسرے حصے میں مجتبیٰ حسین کی منتخب تحریریں پیش کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں پہلی تحریر ''اپنی یاد میں'' ایک وفاتیہ ہے جس میں مجتبیٰ حسین نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں اپنے حالاتِ زندگی اور اپنی موت کا حال بیان کیا ہے۔ اپنی موت کے بارے میں لکھتے ہیں: ''بچوں نے انھیں بہت جگایا مگر مرحوم جاگنے پر راضی نہ ہوئے۔ جاگ کر بھی کیا کرتے، اب دنیا میں ان کے لیے کوئی کام بھی تو باقی نہیں رہ گیا تھا۔ لتا منگیشکر کا گانا وہ سن چکے تھے۔ غالب اور شیکسپیئر کو پڑھ چکے تھے۔ بڑے غلام علی خاں اور بھیم سین جوشی کو بھی نپٹا چکے تھے اور تو اور انھیں وہ ایک ہزار روپے بھی واپس مل گئے تھے جنھیں وہ ایک کتاب میں رکھ کر بھول چکے تھے۔..... دلچسپ بات یہ تھی کہ ان کے مرنے سے ادب میں کوئی خلا پیدا نہیں ہوا کیوں کہ مرحوم کا دعویٰ تھا کہ لوگ مر کر ادب میں خلا پیدا کرتے ہیں لیکن انھوں نے زندہ رہ کر ادب میں لگاتار خلا پیدا کیا تھا۔'' اس حصے میں پیش کیے جانے والے دیگر مضامین کے عناوین ہیں: ''غزل سپلائنگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی پرائیویٹ اَن لمیٹیڈ''، 'مشاعرے اور مجرے کا فرق'، 'دیمکوں کی ملکہ سے ایک ملاقات'، 'خوشونت سنگھ کی یاد میں'، 'اردو کا آخری قاری'۔ مندرجہ بالا سبھی مضامین نہ صرف مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں بلکہ اردو مزاحیہ ادب میں شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین مشہور امریکی ادیب مارک ٹوئن کو اپنا پسندیدہ ادیب اور مزاح نگار تسلیم کرتے ہیں۔ اس مناسبت سے مارک ٹوئن کے ایک مشہور خاکے کا رائحہ نقوی کے ذریعے کیا گیا ترجمہ بہ عنوان ''مقدر'' بھی اس خصوصی شمارے میں شامل کیا گیا ہے۔

چوتھا اور آخری حصہ مجتبیٰ حسین پر لکھے گئے مختلف مضامین پر مشتمل ہے جو پروفیسر شمیم حنفی، مولانا علی ناصر سعید عبقاتی، فیاض رفعت، بیگ احساس، صبیحہ انور، معصوم مرادآبادی، گل رعنا، محسن خاں، رفیق احمد اور صابر علی سیوانی کے تحریر کردہ ہیں۔

فیاض رفعت نے 'مجتبیٰ حسین کی بے مثال فنکاری' میں مجتبیٰ حسین کے سفر نامے 'جاپان چلو' اور ان کی کالم نگاری و خاکہ نگاری کا مزاحیہ انداز میں جائزہ لیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ان کی یار باشی، دوست نوازی اور بذلہ سنجی سے متعلق بھی واقفیت بہم پہنچائی ہے۔ مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں: ''ان کی ہزار خوبیوں میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر بات میں مزاح کا پہلو نکال لیتے ہیں یا یوں کہیے کہ مزاح ان پر نازل ہوتا ہے۔''

بہ اعتبار مجموعی ماہنامہ ''نیا دور'' کا یہ شمارہ مجتبیٰ حسین کی حیات و خدمات کا جامع احاطہ کرتا ہے اور ہمارے عہد کے اس بہترین مزاح نگار کے مداحوں کے لیے ایک گراں قدر تحفہ ہے۔ آرٹ پیپر پر چھپے، صوری و معنوی دونوں اعتبار سے خوب صورت اس شمارے کی قیمت صرف پندرہ روپے ہے جو اس گرانی کے دور میں نہایت کم ہے۔ امید ہے کہ قارئین اس کے مطالعے سے اپنے ذوق کو سیراب کریں گے۔

☆☆☆

مراسلات

● 'آجکل' جنوری 2019 کا شمارہ اپنی شاندار روایت کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔اداریہ میں کثیر اللسانی معاشرہ کے مطالعہ کی روشنی میں آپ کی رائے ہے کہ ایک سے زائد زبانیں سیکھنا اردو بولنے والے طبقے کی اشد ضرورت ہے، قابل عمل ہے۔ہمارے بچے اردو کے ساتھ عربی (قرآن اور دینیات کے لیے) ہندی قومی زبان ہونے کی وجہ سے اور انگریزی مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے تو پڑھتے ہی ہیں۔ ہمارے لیے سب سے بڑا سوال اردو کی بقا کا ہے۔ کے کے کھلر کے مضمون ''ہندوستان کے تہوار اور مذہبی رسومات کثرت میں وحدت کے آئینہ دار'' پڑھ کر بچپن کے میلوں اور تہواروں کی خوشی کی یاد تازہ ہوگئی۔ یہ صحیح ہے کہ اب تہواروں اور میلوں کی اہمیت کم ہوگئی ہے کیونکہ تفریح کے نئے سامان آگئے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحئی صاحب نے اپنے مضمون ''ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام: شخصیت اور شاعری'' میں ڈاکٹر کلام کی شاعری اور ان کی انسانیت نوازی کو اس طرح روشن کیا ہے کہ ان کے میزائل مین کے مقام پر ان کی شاعری اور انسانیت بھاری لگ رہی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اچھا انسان بننا بھی آسان نہیں ہے۔ڈاکٹر خالد اشرف، معصوم مرادآبادی اور ڈاکٹر ریحان حسن صاحبان نے پاکستان کی سیاسی اتھل پتھل میں فہمیدہ ریاض کی احتجاجی شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ بے شک فہمیدہ ریاض کی شاعری اور شخصیت ہر دور میں قابل تقلید رہے گی۔غزلوں کا گلدستہ بھی تازہ اور خوشبودار ہے۔شموئل احمد کی کہانی 'احمق' اچھی لگی۔باجی زندگی بھر سریہ کو احمق کہتی رہی۔آخر میں سریہ نے باجی کی احمقانہ حرکت کی نشاندہی کردی۔ لالچ انسان کو احمق بنا دیتا ہے۔ مجھے اپنا ایک شعر یاد آگیا:

آنکھوں کو میری ایسی بینائی دے
سونے اور پیتل کا فرق دکھائی دے

نثار راہی نے اپنی کہانی 'منشی مرغوب' میں وفاداری اور نفس پر قابو رکھنے کی اچھی مثال پیش کی ہے۔انیس اعظمی نے اپنے ڈرامہ چوراہے میں جھگی جھونپڑی میں رہنے والے غریبوں کی زندگی کا گہرائی سے مشاہدہ کیا ہے اور ان کے دکھ درد اور چھوٹی موٹی خوشیوں کو پیش کر کے قابل ستائش کام کیا ہے۔آنند لہر نے اپنی کہانیوں میں زیادہ تر سرحد پر رہنے والے لوگوں کی زندگی کی کسمپرسی کو موضوع بنایا ہے۔ان کی کہانیاں مجھے بھی پسند ہیں۔ ڈاکٹر ابرار رحمانی نے انہیں بہترین خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

عبدالحئی پیام انصاری
پیر ولی بازار، گورکھپور

● آجکل 2019 کے شمارۂ اول نے حسب سابق دروازۂ شوق پہ بروقت دستک دی۔ڈاکٹر عبدالحئی نے میزائل مین اے پی جے عبدالکلام کی من موہنی شخصیت کی عکاسی اس خوبصورتی سے کی ہے کہ ٹی ایس ایلیٹ کے مندرجہ ذیل ہمالیائی الفاظ کا سلسلہ نگاہوں کے سامنے آویزاں ہوگیا۔

سچ مچ ہندوستان کا یہ عظیم سپوت قمر نما خورشید اور خورشید نما قمر ہی تو تھا۔ڈاکٹر عبدالحئی کے مضمون سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ اس فرزند عظیم کی ذات صلاحیتِ قویٰ اور نزاکتِ احساس کا حسین مرقع تھی۔

شموئل احمد نے اپنے ادب کے دالان میں معصوم یتیم بچی کے سر پر اس محبت اور شفقت سے ہاتھ پھیرا کہ خوشبو کا جھونکا سرزمینِ ہند سے مدینہ طیبہ کی جانب جاتا ہوا محسوس ہوا۔افسانہ نگار کے جذبۂ انسانیت نے گویا نوکِ خار سے شبنم کے موتی کو اپنی پلکوں سے اٹھا کر آرٹ گیلری میں سجا دیا ہے۔دعا گو ہوں کہ افسانہ نگار کی آرٹ گیلری میں اس انداز سے روز افزوں اضافہ ہوتا چلا جائے۔

فہمیدہ ریاض، خالد اشرف اور معصوم مرادآبادی کے مضامین شائع کر کے آپ نے مرحومہ کو بطریقِ احسن خراجِ عقیدت پیش فرمایا ہے۔افسوس، صد افسوس کہ محفلِ اہلِ قلم سے فہمید ریاض اٹھ کر سوئے عدم چلی گئیں یوں ادب کا انمول خزینہ ایک بے بہا نیلم سے محروم ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

متین اچل پوری
بیابانی، اچل پور، 444806، ضلع امراوتی، مہاراشٹر

● پاکستان کی جن شاعرات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ان میں ایک فہمیدہ ریاض بھی ہیں جن کی شاعری ان کی ذات کی نہیں بلکہ عورت ذات کی نمائندگی کرتی ہے اس لیے جنوری کے شمارہ میں سب سے پہلے خالد اشرف اور معصوم مرادآبادی کے مضامین پڑھے جو فہمیدہ کے متعلق ہیں۔ان

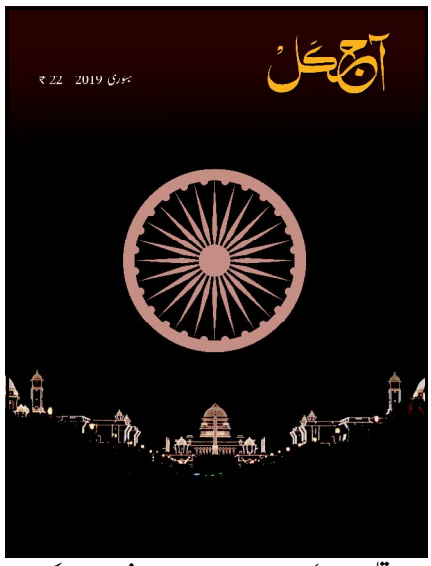

دونوں قلم کاروں کی اس رائے سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا کہ فہمیدہ ایک احتجاجی لہجہ کی شاعرہ ہیں۔اس ضمن میں ان حضرات نے ان کے شعری مجموعہ 'بدن دریدہ' کے دیباچہ کا حوالہ دیا ہے جس میں فہمیدہ نے اپنے شعری نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب جاں سے گزرنا ہی ٹھہرا تو پھر سر جھکا کر کیوں جئیں کیوں نہ مقتل کو رزم گاہ بنا دیں۔ کیا انہوں نے اپنے اس قول پر عمل کیا۔انہوں نے تو پاکستانی حکمرانوں کے عتاب سے بچنے کے لیے جلاوطنی کو ترجیح دی اور ہندوستان میں پناہ لی اور وہ یہاں سے لگ بھگ سات سال کے قیام کے بعد اس وقت پاکستان لوٹیں جب ایک حادثہ میں جنرل ضیاء الحق کی موت واقع ہوگئی۔کسی بھی انسان کے قول و عمل میں جب تضاد ہوتا ہے تو اس کے الفاظ اپنی مقبولیت کھو دیتے ہیں۔

شمیم احمد، گورکھپور

● 'آجکل' جنوری 2018 کا شمارہ دستیاب ہوا۔ مجھے ہر مہینے بڑی بے چینی سے اس رسالہ کا انتظار رہتا ہے۔اس مہینے کا شمارہ بھی کافی دلکش رہا۔غزلیں، افسانے، منظومات سبھی قابل ستائش ہیں۔لیکن مجھے ڈاکٹر عبدالحئی کا مقالہ ''ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام: شخصیت اور شاعری'' پڑھ کر کافی خوشی ہوئی۔ مجھے اب تک ان کی شخصیت کا نصف حصہ ہی معلوم تھا۔ مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ ہمارے معاشرہ کی اتنی عظیم شخصیت کے وجود میں شاعری کی صفت بھی خدا نے عطا کی ہے۔انیس اعظمی کا ڈرامہ 'چوراہا' بھی قابل تعریف ہے۔

شمس ناز شمس
بینک روڈ، گاندھی میدان، پٹنہ

● جنوری 2019 کا آجکل نظر نواز ہوا۔ نئے سال کا پہلا اداریہ تفکراتی ضیاء سے منور ہے۔آج بھی اردو بولنے والوں کا فیصد جان کر خوشی ہوئی لیکن اس کے روشن

مستقبل کے تئیں آپ کی تشویش بھی بجا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ صرف اردو دانی موجودہ مسائل کا حل نہیں ہے۔ ہمہ جہت ترقی کے لئے دیگر زبانوں کی خاطر خواہ واقفیت بھی لازمی ہے۔لیکن پہلے ٹھیک ڈھنگ سے اردو تو آجائے۔

ڈاکٹر نسرین کا مضمون اچھا ہے لیکن اشعار کا متن درست نہیں ہے۔کلام صاحب کی زندگی دوسروں کے لئے کردار کا تو نہیں ترقی کا نمونہ ضرور ہوسکتی ہے۔خالد اشرف کی فہمیدہ فہمی ریڈیبل ہے۔ احتجاجی شاعری کا گوشہ ایک عمدہ انتخاب ہے۔ ریحان حسن صاحب کا عنوان اور متن دونوں قاری کو آبدیدہ کرنے والا ہے۔ مرحوم حسن ثنیٰ بیشک اردو ادب کا دریا تھے۔عبدالسلام عاصم کا شعر اور دفتر والا شعر محظوظ نہیں کرسکا،مطلع خوبصورت ہے۔سلیم نثار کو سحر والا شعر نہیں رکھنا چاہیے تھا۔عمران راقم صاحب کی پوری غزل دیدہ زیب ہے۔شموئل احمد کا افسانہ احمق،ان کے طرز کا ترجمان ہے۔ نثار راہی کا افسانہ پیچیدگیٔ حیات اور اس کے حل کی گتھی ہوئی روداد ہے۔ بہروپ کے سہارے دہلی کی سیر ایک دلچسپ وسیلہ ہے۔ انیس اعظمی کا افسانوی ڈھب بڑا دلکش ہے۔ ڈرامہ چوراہا یقیناً پڑھنے کے قابل ہے۔

ابرار رحمانی کے قلم سے،اردو ادب کا وکیل،آنند لہر چہ خوب ہے۔وحید اختر جہان اردو کے ایک مستند وقار و معیار کا نام ہے۔تمام اہالیان وطن کو آجکل کے توسط سے میں دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

شکیل سہسرامی،پٹنہ،بہار

● 'آجکل' دسمبر 2018 کا اداریہ پڑھا۔بے حد پسند آیا۔جگن ناتھ آزاد سے رگھوپتی سہائے اور فراق گورکھپوری بھی متاثر تھے۔ان دونوں حضرات سے میری گہری انسیت و محبت رہی۔ان سے ملاقاتیں بھی ہوتی رہتی تھیں اور ہماری خط و کتابت بھی۔ آزاد صاحب خصوصی طور پر علامہ شیخ محمد اقبال سیال کوٹی کے مداح و خوشہ چیں تھے۔فراق صاحب دلی و قلبی و ذہنی طور پر خدائے سخن میر تقی میر اکبر آبادی کے معترف،معتقد اور مقلد تھے۔

'آجکل' دسمبر کے شمارہ کے صفحہ نمبر 42 پر مطبوعہ و شائع شدہ سخنور حیرت فرخ آبادی نے 'پاں و' (پانو، پاؤں) شبد یا لفظ کو 'فعلن' کے وزن پر استعمال کیا،نظم کیا ہے۔یہ بالکل غلط ہے! اساتذہ نے 'پاں و' لفظ کو 'فاع' یا 'فعل' کے وزن پر نظم کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔بحر ہزج مثمن سالم کے مخصوص ارکان ''مفاعیلن (چار بار)'' کے تحت حیرت،حسن نواب حسن کے متعدد اشعار بشمول مطلع و مقطع اسقام،اغلاط و معائب سے پر ہیں۔ بحر ہزج مثمن اخرم مکفوف محذوف کے اہم ارکان ''مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن'' کے تحت مہدی پرتاپ گڑھی کی غزل کے اشعار میں 'چشتی'۔'مہدی' وغیرہ کی چھوٹی 'لیے'' (ی) اردو،عربی اور فارسی عروضی اصول کے مطابق وزن و بحر سے گرگئی۔ نیر قریشی گنگوہی کی مطبوعہ غزل کے پانچویں شعر کا پہلا مصرعہ مستعملہ و مروجہ ارکان بحر یعنی ''فعول فعلن فعول فعلن'' میں سمانے سے قاصر ہے! ظفر اقبال ظفر کی غزل کے مطلع کا پہلا مصرع غلط شائع ہوا ہے۔'آجکل' جیسے نہایت معیاری Invigorative، Invincible، Inviolable اور خالص ادبی،اعلیٰ تہذیبی و تمدنی و ثقافتی (گنگا جمنی) اور بین الاقوامی رسالہ کی لاج بہرحال رکھنی ہوگی۔جیسے ماہنامہ ''شاعر،نقوش،اوراق،صریر،سرسبز،رام،جاوید،جواز، مریخ،زبان و ادب،محبت،شیرازہ'' وغیرہ کی عصمتیں برقرار ہیں۔اور کیا عرض کروں؟ اور کیا مشورہ دوں۔'آجکل' کے استیعاب شمارہ جات پر میری تبصراتی و انتقادی کتاب پریس میں ہے۔باقی خیریت اور بے حد مصروفیت ہے۔خدا آپ لوگوں کو افواہوں اور بدخواہوں سے بچائے۔

ڈاکٹر رام داس،خدیجہ نرسنگ ہوم،جھارکھنڈ،رانچی

● 'آجکل' ماہنامہ دسمبر 2018 کا خوبصورت شمارہ میرے زیر مطالعہ ہے۔اداریہ،اردو کے عاشق صادق جگن ناتھ آزاد،مدیر حسن ضیا کی تحریر میں آزاد صاحب کی شہرت اور ان کی قابلیت کے ساتھ علامہ اقبال پر لکھے گئے شعری و ادبی غیر مطبوعہ جلدیں بھی ضائع ہونے کا اظہار خیال بہتر رنگ میں کیے ہیں جو قابل ستائش ہے۔

جگن ناتھ آزاد صدی: چند باتیں آزاد کے بارے میں۔شہباز حسین بھی آزاد صاحب کے سلسلے میں اچھی خاصی تحریر میں ان کے اشعار سے ان کی شناخت کرائی ہے،جو قابل قدر ہے۔اردو کا سپہ سالار جگن ناتھ آزاد،پروفیسر شہزاد انجم،معروف شاعر تلوک چند مرحوم کے حوالے سے جگن ناتھ آزاد کو شاعری ورثے میں ملی ہے۔ انہوں نے عوام تک لانے کی پوری سعی کی ہے جو نظروں میں خاص بہتر رنگ نمایاں ہیں۔جسے انکار کرنا ناممکن ہے۔

یادرفتگاں میں راشد انور راشد،ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری،محبوب خاں اصغر بعنوان قاضی عبدالستار،قاضی عبدالستار کا پیتل کا گھنٹہ،مضطر مجاز کی یاد میں چند آنسو کو پڑھنے کے بعد ان کے متعلق خاص معلوماتی کارنامے ذہن کو حاصل ہوئے۔ یہ سبھی حضرات پر بہتر مضامین تحریر کرکے دل پہ یادرفتگاں کا نقش چھوڑا ہے۔یہ لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

'نوبل انعام کے پنجرے' عنوان کے تحت ڈاکٹر ابرار رحمانی نے نوبل انعام کے سلسلے میں فرمایا ہے،وہ جنسیت سے لے کر نوبل پرائز اکیڈمی تک انہوں نے جائزہ لے کر امریکی خاتون سائنس داں کی شخصیت کی جستجو کرکے ان کی شناخت کرائی ہے جو حقیقتاً جائز اور حوصلہ مند ہے اور صحیح دائرے میں نمایاں ہیں۔

ہمسر صدیقی،مسری گھراری،سمستی پور

● ماہ نومبر کا 'آجکل' پیش نظر ہے۔اس شمارہ میں شامل سبھی مقالات محنت سے لکھے گئے ہیں۔''سفر ہے شرط'' اچھا لگا۔ٹیگور پر مضامین ٹیگور کی یاد تازہ کرتی ہے۔سنبھل کے چند قدیم فارسی شعرا سرزمین سنبھل کی فارسی خدمات کا اعتراف کرایا ہے۔رضوانہ بیگم کا مضمون ''بہار کی اردو کی درسی کتب کا تجزیاتی مطالعہ'' میں تجزیہ نگار نے تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے غور و فکر اور مطالعہ کرنے کی دعوت بھی دی ہے۔

بہار اسٹیٹ ٹیکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن لمیٹڈ، پٹنہ کے تعاون سے پورے صوبہ بہار کے لیے محکمہ فروغ انسانی وسائل حکومت بہار سے منظور شدہ اردو کی نویں اور دسویں جماعت کی درسی کتاب 'درخشاں' اول اور دوم ہے۔یہ سچ ہے کہ کسی ملک اور اس کے شہریوں کا مستقبل اس کے نظام تعلیم پر منحصر ہوتا ہے اور نصاب تعلیم کی روح اس کو جلا بخشتی ہے۔ یہ وہ تعلیمی نصاب ہے جس پر نونہالان چمن ہی نہیں بلکہ دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق نئی نسل کو تیار کرنے کی ذمہ داری ہے۔مگر افسوس کہ ڈائرکٹر انچارج حسن وارث این سی ای آر ٹی بہار کا دعویٰ ہے کہ اس کتاب کی ترتیب میں اس بات کی بھی پوری کوشش کی گئی ہے کہ اردو ادب کے مختلف ادوار کے مصنفین کی تخلیقات جگہ پائیں۔

جب کہ نصابی کتاب کی ترتیب میں کوشش اس بات کی ہونی چاہئے تھی کہ نہم اور دہم درجہ کے بچوں کی ذہن سازی،کردار سازی ہو اس کے لیے سبق آموز،نصیحت آموز،فرض شناسی،احساس ذمہ داری،صبر و تحمل،ہمت و شجاعت،مستعدی و جفاکشی اور کچھ کر دکھانے کا جذبہ اور ہمت پیدا ہو۔اپنے مقصد کو پانے کے لیے سب کچھ کھونے کا،ہر چیز قربان کردینے کا عمل،تدبیر،جذبات و خواہشات اور ہیجانات پر قابو دینے والے مضامین انشائیہ،افسانہ، ناول،ڈرامہ،طنز و مزاح،مقالہ،سفرنامہ،خودنوشت،خاکہ، خطبہ،نظم،غزل،قصیدہ،رباعی،مرثیہ،مثنوی،قطعہ،گیت اور دوہے وغیرہ نصاب میں شامل ہوں جس سے ملک و قوم کے مستقبل کو روشن کرنے اور ان کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی ہمت و جرأت پیدا کرسکیں۔ملک کو کچھ دیں۔ملک سے کچھ لینے کی امید نہ رکھیں۔

ڈاکٹر ایم عارف،کالی باغ،بتیا،بہار

مولانا آزاد کا ایک خاص انداز تھا۔ وہ کلکتہ میں رہ کر بھی کلکتہ میں نہیں رہتے تھے۔ سارے ہنگاموں سے دور بالی گنج کے ایک بنگلے میں رہتے تھے۔ سب سے بڑا کام مطالعہ تھا۔ یا پھر جب کوئی ان سے ملنے جاتا تو اس سے مل لینا۔ کلکتہ میں ان کے ہزاروں جاں نثار تھے جو ان کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھے۔ مگر ان کی بے نیاز طبیعت نے کبھی کسی سے کسی طرح کی فرمائش گوارا نہیں کی۔ وہ کبھی کسی سے ملنے نہیں جایا کرتے تھے۔ سال میں دو بار عیدین کی نماز پڑھانے کلکتہ میدان میں آتے تھے۔ لیکن جب کانگریس کے کچھ مخالفوں نے ان کے خلاف ہنگامہ آرائی کی تو اسے بھی ترک کر دینے پر آمادہ ہو گئے، لیکن ان کے عقیدت مندوں نے انہیں گھیر لیا اور وہ ان کی خاطر نمازیں پڑھاتے رہے۔ مولانا سے ملنے کا کئی بار اتفاق ہوا۔ ہر بار پہلے سے زیادہ متاثر ہو کر آیا۔ ان کی شخصیت میں بڑی مقناطیسی طاقت تھی جو ہر ملنے والے کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ ان کے بدترین سیاسی مخالفین ارادہ کر کے گئے کہ بحث کریں گے لیکن جب ان سے ملے تو دو لفظ بھی نہ بول سکے اور حضور حضور کر کے باتیں کرتے رہے۔ نام لینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ مگر میں نے خود اپنی آنکھوں سے چند آدمیوں کو ایسے حال میں دیکھا ہے۔ اپنے بارے میں کچھ کہنا فضول ہے۔ میں تو پہلے ہی سے ان کی شخصیت سے متاثر تھا اور بڑی عقیدت کے ساتھ گیا تھا۔ یہ بھی کہہ دوں کہ میں بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتا لیکن جب پہلی بار مولانا نے بڑی شفقت کے ساتھ کچھ پوچھا تو میرا حلق رعب سے خشک ہو گیا اور میں کوئی جواب نہیں دے سکا۔ مولانا کی شخصیت میں جادو تھا جو ہر ملنے والے پر اثر کرتا تھا۔

دوسری ذات آغا حشر کی تھی۔ مولانا سے بالکل مختلف۔ گرچہ ایک زمانے میں دونوں گہرے دوست تھے۔ مولانا کے برعکس آغا حشر باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ میں نے ان کی شراب نوشی کے بہت سے قصے سنے تھے لیکن جب میں نے انہیں دیکھا تو وہ شراب نوشی ترک کر چکے تھے۔ سیالدہ کے پاس حیات لین کے ایک مکان کی اوپری منزل میں رہتے تھے۔ نہ بیوی تھی نہ کوئی بچہ۔ ان کے ایک بھانجے عبدالجبار ساتھ رہتے تھے اور دو ملازم یعنی کل چار آدمی تھے۔ لیکن ان کا گھر ہر وقت ملنے والوں سے بھرا رہتا تھا۔ نوجوان یا بوڑھا ہر ایک سے گھل مل کر اس طرح باتیں کرتے تھے جیسے ان کا بے تکلف دوست ہو۔ آغا حشر ڈرامہ نگار تھے۔ میڈن تھیٹرز کے لیے ڈرامے لکھا کرتے تھے اور عام لوگ انہیں اسی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن ان کا دینی علم بہت زیادہ تھا۔ قرآن و حدیث اور اسلامی تاریخ پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ جب وہ کسی مسئلے پر بحث شروع کرتے تو اچھے اچھے عالم دین ان کا منہ تکتے رہ جاتے تھے۔ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ آغا صاحب شروع زندگی میں اچھے مناظرہ باز رہ چکے تھے۔ وہ عیسائیوں اور آریوں سے مناظرے کیا کرتے تھے اور اسی خدمت کے لیے بمبئی کی ایک انجمن میں ملازم بھی تھے۔ اسی زمانے میں مولانا آزاد اور مولانا ظفر علی خاں سے ان کی دوستی ہوئی تھی۔ آغا صاحب خوش اخلاق اور خوش گفتار انسان تھے۔ تھیٹر کے ایکٹروں سے لے کر پروفیسروں تک کا جمگھٹا ان کے پاس لگا رہتا تھا۔ آغا صاحب کی گفتگو میں لطیفوں اور چٹکلوں کے علاوہ گالیوں کی بھی بھرمار ہوا کرتی تھی لیکن ان کی گالیاں اوروں کی گالیوں سے بالکل مختلف انداز کی ہوتی تھیں۔ ان کی گالیوں میں بھی ڈرامائی انداز ہوتا تھا۔ ان گالیوں میں تصنیف کی شان ہوتی تھی۔ اگر گالیوں کو بھی فنون لطیفہ میں جگہ ملتی تو یقیناً آغا صاحب اس فن کے سب سے بڑے فنکار ہوتے۔ ان گالیوں کو ان کی زبان سے سن کر لطف تو لیا جا سکتا تھا لیکن لکھا نہیں جا سکتا۔

آغا صاحب رنگین طبیعت اور اور بے ریا انسان تھے۔ اپنی جوانی اور اپنے عشق یا آوارگی کے قصے بھی خاص احباب سے بیان کرنے میں نہیں جھجکتے تھے۔ بلکہ پرانی یادوں سے لطف لیا کرتے تھے۔ خوب ہنستے تھے اور جب موڈ میں ہوتے تو کہتے تھے کہ بھئی میں نچنیا بجنیا ہوں۔ مولوی مولانا نہیں۔ ان کا اس سستی کے زمانے میں بھی ہزاروں کا خرچ تھا۔ روپے آتے تھے اور خرچ ہو جاتے تھے۔ روپے کب آئے اور کب خرچ ہوئے اس کا اندازہ شاید انہیں بھی نہ ہوتا تھا۔ مہینوں قرض پر ہانڈی چلتی تھی۔ پھر روپے آتے ہی سب کا ایک ایک دھیلا وصول کر دیا جاتا تھا۔ ان کو اپنے اخراجات پر قابو حاصل نہیں تھا۔ دل کے سخی تھے۔ ان کے پرانے ایکٹر ملازم بیکار تھے، ان کی مدد کرنا آغا صاحب ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ روپے ملتے ہی تقسیم کا عمل شروع ہو جاتا تھا اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ گھر سے نکل کر کہیں جانے کے لیے ٹیکسی اور فٹن کا کرایہ تو ایک طرف ان کے پاس ٹرام کا کرایہ بھی نہیں رہ جاتا تھا۔ انہوں نے زندگی میں لاکھوں کمایا اور لاکھوں گنوایا۔ ایسے شخص سے کون متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے۔ اگر آغا صاحب کے بارے میں اپنی یادداشت پر زور دے کر لکھتا جاؤں تو نہ جانے کتنے صفحات سیاہ ہو جائیں پھر بھی تذکرہ نامکمل ہی رہے۔

کلکتہ کی تیسری بڑی شخصیت خان بہادر رضا علی وحشت کی تھی۔ وحشت صاحب ملک کے بڑے شاعر اور اسلامیہ کالج میں اردو کے استاد تھے۔ ان کی ایک ذات سو انجمن کے برابر تھی۔ بے حد شفیق اور وضع دار بزرگ تھے۔ کلکتہ کا تعلیم یافتہ شاعر طبقہ ان کا حلقہ بگوش تھا۔ ان کے شاگردوں میں چند بڑی ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ علامہ جمیل مظہری، قمر صدیقی، محمود طرزی، آصف بنارسی، عباس علی خاں بے خود، وحشت صاحب بنگالی تھے لیکن اردو زبان پر انہیں عبور تھا۔ غالب کے انداز میں کہنے کی بہتوں نے کوشش کی لیکن وحشت صاحب سے زیادہ کسی کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی بھی ان سے ایک بار ملا ان کا بندہ بے دام بن کر رہ گیا۔ لیکن جب ملتے تھے تو خلوص کے ساتھ۔ وہ زمانہ ان کے لیے سخت تھا مگر وہ اپنی علمی ادبی مشغولیتوں میں غرق رہے اور کبھی کسی نے ان کے چہرے پر شکن نہیں دیکھی۔ اسی رکھ رکھاؤ کے ساتھ ملتے تھے جیسے کوئی خوشحال انسان ملتا ہو، کبھی زمانے کا شکوہ نہیں۔ ان کی کتاب مغل اور اردو اس زمانے میں چھپی تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کی کتابیں شائع ہو جائیں لیکن اخراجات کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ آخر مولانا شائق احمد عثمانی نے ان کی کتابیں شائع کرنے کی ذمہ داری لی۔ لیکن مغل اور اردو کے علاوہ کوئی دوسری کتاب شائع نہیں کر سکے۔ مولانا شائق خود بلا کے ذہین عالم اور مقرر تھے۔ مولانا آزاد انہیں دیوبند سے کلکتہ لائے تھے۔ ان پر مولویوں کی خشکی نام کو نہ تھی۔ بہترین اور مخلص دوست تھے۔ اگر خود اخبار اور لیڈری کے چکر میں نہ پڑتے تو ملک کے بڑے عالم دین ہوتے، یا بڑے ناول لکھنے والے۔ ان کی لکھی ہوئی سورۂ بقرہ کی تفسیر اور ان کے ناول بڑی دیدی اور چاند تارا اس کا بہت بڑا ثبوت ہیں۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، مولانا آزاد کے عزیز دوست اور رفیق و ہمدم۔ الہلال اور البلاغ کی مجلس ادارت میں رہے۔ نہایت کٹر قوم پرست اور ملک کی آزادی کے دلدادہ، نہایت خاموش اور محنتی انسان، عربی زبان پر انہیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ الہلال اور البلاغ کے بند ہو جانے کے بعد سے صرف مصر کے چند عربی اخباروں کے لیے لکھا کرتے تھے۔ بہت کم آمیز انسان تھے۔ ان کا حلقہ بے حد مختصر تھا۔ سارے کلکتہ میں چند آدمیوں سے ان کے تعلقات تھے لیکن بے حد جوشیلے انسان بھی تھے جب مسلم کانفرنس

والوں نے کلکتہ کی فضا مکدر کردی تو اپنے دوست ڈاکٹر عبدالشکور کی مدد سے اخبار روزانہ ہند جاری کیا اور پانچ چھ آدمیوں کا کام اکیلے کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی محنت اور قلم کی طاقت سے کلکتہ میں قوم پرست مسلمانوں کی ساکھ دوبارہ قائم کردی تھی۔ روزانہ 'ہند' کن حالتوں میں جاری ہوا اور برابر نکلتا رہا۔ یہ الگ داستان ہے۔ البتہ یہ کہنا ہی پڑے گا کہ ہند کا اجرا اور اس کی زندگی مولانا ملیح آبادی کے عزم اور استقلال کی مرہون منت تھی۔ جب کوئی قوم پرستی کی باتیں کرتے بھی ڈرتا تھا تب مولانا نے اخبار نکالا۔ فرقہ پرستی اور فرقہ پرستوں پر بھرپور حملے کیے۔ ان سے لڑتے رہے۔ اگر وہ مضبوط کردار کے اور صاحب عزم انسان نہ ہوتے تو نہ تو ہند جاری ہوتا اور نہ باقی رہتا۔ مولانا ملیح آبادی آہنی کردار کے آدمی تھے اور مقصد کے لیے ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔

کلکتہ ہی میں کچھ باہر سے آنے والے شاعروں اور ادیبوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ منشی پریم چند، سدرشن، امتیاز علی تاج، اختر شیرانی، احسان بن دانش، مولانا ظفر علی خاں وغیرہ خاص طور پر ذکر کے لائق ہیں۔ منشی پریم چند ماہنامہ ''وشال بھارت'' کے ایڈیٹر پنڈت بنارسی داس چترویدی کے مہمان تھے۔ جبھی اختر حسین رائے پوری کے ساتھ ان سے ملا تھا۔ ان کی سادہ زندگی نے بہت زیادہ متاثر کیا اور کھدر کی دھوتی باندھے اور کھدر کی نیم آستین پہلے بید کی ایک چٹائی پر بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ ان کی زندگی میں وہی سادگی تھی جو ان کے افسانوں میں ہے۔ ان کی آواز میں وہی خلوص تھا جس کی لہریں ان کے افسانوں میں پھیلی ہوئی ملتی ہیں۔ ایسے انسان سے متاثر نہ ہونا ناممکن سی بات ہے۔

کلکتہ کی خود ایک عظیم شخصیت ہے اور وہاں رہ کر اس سے متاثر ہوئے بغیر کوئی نہیں رہ سکتا۔ اس بڑے شہر میں کروڑ پتی بھی رہتے ہیں، کلرک بھی، مزدور بھی اور بھیک مانگنے والے بھی۔ جرائم پیشہ بھی اور بڑے دانشور بھی۔ مساوات یہاں کی فضا میں ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ پر اہم ہے۔ ہر شخص اپنا رول ادا کرتا ہے۔ ہر آدمی ضروری ہے۔ کوئی انسان وہاں کچھ دنوں رہنے کے بعد بھی اس کے اثر سے ساری زندگی آزاد نہیں ہوسکتا۔

1936 میں پٹنہ واپس آ گیا۔ یہاں کی زندگی میں ملنا ملانا اپنی جگہ پر لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں منشی دیانرائن نگم کے علاوہ مجھے کسی نے متاثر نہیں کیا۔ 'زمانہ' کانپور میں میرے چند مضامین شائع ہوئے تھے اور خط و کتابت تھی لیکن ملاقات نہیں تھی۔ ایک دن ایک بزرگ غریب خانے پر پہنچے۔ چوڑی دار پاجامہ، شیروانی، سر پر گول ٹوپی اور ہاتھ میں چھڑی۔ انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔ میں احتراماً کھڑا ہوگیا یوں بھی وہ میرے والد بزرگوار کی عمر کے تھے۔ بولے پٹنہ یونیورسٹی کے ایک بورڈ کی میٹنگ میں شرکت کے لیے آیا ہوں۔ تم سے ملے بغیر کیسے چلا جاتا۔ اس کے بعد تو ان سے برابر ملاقاتیں رہیں۔ وہ جب بھی پٹنہ تشریف لاتے خط لکھ دیتے، اور میں ان سے ملنے جاتا یا دلّی جاتے ہوئے میں کانپور اتر جاتا۔ منشی جی قدیم تہذیب کا مکمل نمونہ تھے جو اب ختم ہوچکی ہے۔ زندہ دل با اخلاق، خوش گفتار اور نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرنا اپنا فرض سمجھنے والے۔ واقعہ ہے کہ ان کی ہمت افزائیوں نے بہتوں کو ادیب بنا دیا۔ منشی پریم چند سے لے کر ٹھاکر چندر بھوشن سنگھ ادبی دنیا میں ان کے لائے ہوئے تھے۔ زمانہ کے مدیر کی حیثیت سے انہوں نے 45 سال تک زبان و ادب کی خدمت کی۔ ان کی ذات ایک ادارہ تھی زمانہ سے ہمیشہ انہیں مالی نقصان پہنچا لیکن انہوں نے کبھی شکایت نہیں کی۔ خوشی سے نقصان برداشت کرتے رہے۔ اردو ہندی کی کشمکش کے زمانے میں ایک ہندی پریمی نے ان سے کہا کہ اگر زمانہ ہندی میں جاری کرنا منظور کرلیں تو ہم چالیس سال کے نقصانات کو پورا کردیں گے۔ منشی جی نے ان کے اس آفر کے جواب میں مومن کا شعر لکھ بھیجا:

عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

1938 میں پہلی بار ڈاکٹر ذاکر حسین اور مولوی عبدالحق سے ملا اور دونوں نے بے حد متاثر کیا۔ ان دونوں بزرگوں کی زندگی ایک مقصد کے لیے وقف تھی۔ زندگی مقصد کے لیے کس طرح وقف کی جاتی ہے ان بزرگوں سے سیکھنے کی چیز تھی اپنی زندگی میں میں سب سے زیادہ بابائے اردو مولوی عبدالحق سے متاثر ہوا جتنی بار ملا ان سے قرب ہوتا گیا یہاں تک کہ انہوں نے مجھے آخر کھینچ ہی لیا اور میں ان کی ہدایت پر آدی باسیوں میں اردو کی تبلیغ اور اشاعت کا کام کرنے کے لیے اس عہد کے ساتھ رانچی گیا کہ زندگی میں اب کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔ چھوٹا ناگپور میں اردو مرکز کا قیام اور چھوٹے چھوٹے اردو اسکولوں اردو تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ بظاہر سب کچھ مجھے کرنا تھا ساری ذمہ داریاں میری تھیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرا ہر قدم ان کی ہدایت کے مطابق اٹھتا تھا۔ ان کی زندگی رئیسانہ بھی تھی اور فقیرانہ بھی۔ ان کی ہر سانس اردو کی ترقی کے لیے وقف تھی جو اردو کا دوست تھا وہ ان کا دوست تھا، جو اردو کا دشمن تھا وہ ان کا دشمن تھا۔ دنیا کی کسی دوسری چیز سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انجمن ترقی اردو کی سرگرمیوں کے زمانے میں پنڈت دتاتریہ کیفی اور مولانا محمود شیرانی سے نیاز حاصل ہوا۔ یہ دونوں بزرگ مخصوص کردار کے مالک تھے۔ شیرانی صاحب کو تو پڑھنے اور لکھنے کے سوا دنیا کی کوئی خبر ہی نہیں رہتی تھی۔ ان کو یہ ہوش بھی نہیں رہتا تھا کہ ان کے کپڑے صاف ہیں یا میلے ہوچکے ہیں۔ پنڈت کیفی ان کے برعکس بہت سلیقہ کے آدمی تھے۔ ہر کام کا وقت مقرر، ہر چیز اپنی جگہ پر درست، دریا گنج دہلی میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی انجمن کے کرایہ پر تھی۔ بابائے اردو رہتے بھی اس عمارت میں تھے۔ آخر وہ اردو کو چھوڑ کر کہاں جاتے۔

زندگی میں بہتوں سے ملا ہوں اور ملنے کے بعد میرے ذہن پر اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوا ہے لیکن یہ سلسلہ اتنا طویل ہے کہ لکھنے بیٹھوں تو کم سے کم داستان امیر حمزہ ضرور بن جائے اب شدت کے ساتھ سوچ رہا ہوں کہ مضامین کا ایک سلسلہ شروع کروں۔ بزرگوں سے متعلق ہم عصروں سے متعلق اور جوانوں سے متعلق اور نوجوانوں سے متعلق۔

زندگی کا کارواں بڑھتا جا رہا ہے لیکن اس کا غبار اب بھی نگاہوں میں ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ بھی نظروں سے اوجھل ہوجائے اس سلسلے کو مکمل کرلینا چاہتا ہوں۔

☆☆☆

آجکل کی فائل سے

(اپریل 1972ء)

ایڈیٹر: شہباز حسین

سب ایڈیٹر: نندکشور وکرم

سوشل میڈیا کے لٹکے جھٹکے

فیس بک ایک اوپن فورم ہے، جہاں کوئی بھی اپنی بات پوری آزادی کے ساتھ رکھ سکتا ہے۔ لیکن اظہار رائے کی آزادی کے نام پر اپنی غلط باتوں کو جس طرح سے اور جس بڑے پیمانے پر فیس بک کے ذریعے لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے وہ نہ صرف گمراہ کن ہے بلکہ ناجائز اور غیر قانونی بھی۔ عام لوگوں کے لیے یہ انتہائی مشکل اور پریشان کن بات ہے۔ وہ یہ کبھی سمجھ نہیں پاتے کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔

پچھلے تقریباً دو تین سال سے یہ خاکسار فیس بک کی اس کمی یا خامی کا بری طرح شکار رہا ہے۔ بحیثیت ایڈیٹر آجکل اس ناچیز کو کس کس طرح سے پریشان کیا گیا اسے آپ صرف محسوس کر سکتے ہیں وہ بھی بے یقینی کے ساتھ۔ لیکن پہلے فیس بک کی خوبی اور خرابی پر ایک نظر۔ معتبر ذرائع کے مطابق اس وقت فیس بک پر سب سے زیادہ ہندوستانی سرگرم ہیں۔ گزشتہ ایک سال میں ملک میں فیس بک پر سرگرم لوگوں کی تعداد 27 فیصد بڑھ کر 25 کروڑ پہنچ گئی۔ اب اس معاملے میں ہندوستان امریکہ کو شکست دے کر پہلے نمبر پر پہنچ چکا ہے۔ حیران ہوں کہ روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں۔ سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ فیس بک کی ایک رپورٹ میں یہ بات کہی گئی ہے۔ گزشتہ ایک سال میں ہندوستان میں فیس بک پر فعال لوگوں کی تعداد میں پانچ کروڑ کا اضافہ دیکھا گیا۔ دنیا بھر میں ان کی تعداد 25 کروڑ رہی ہے۔ کچھ دن پہلے فیس بک نے اعلان کیا تھا کہ دنیا بھر میں اس کے سرگرم صارفین کی تعداد دو ٹریلین کے پار پہنچ چکی ہے۔ اس میں اب تک دونوں ممالک میں اس کے صارفین کی تعداد میں ریکارڈ اضافہ ہوا ہے۔ لیکن ہندوستان میں اس اضافہ کی رفتار امریکہ کے مقابلے دوگنی ہوگئی ہے۔ امریکہ میں اس دوران ان کی تعداد میں بارہ فیصد یعنی 26 لاکھ کا اضافہ ہوا ہے۔

اور ہاں! اس فیس بک پر جس قدر جی چاہے اپنا قیمتی وقت برباد کر سکتے ہیں لیکن زیاں کا ہمیں احساس تک نہیں ہوتا۔ بچپن میں اکثر میں دیکھا کرتا تھا کہ محلے کے اوباش قسم کے لوگ چار چار اور پانچ پانچ کی ٹولی میں بیٹھے شطرنج لوڈو اور تاش کھیل رہے ہیں۔ اس کھیل کا انت کیا ہوگا اور کب ہوگا؟ کسی کو نہیں معلوم۔ ہمارا اتنا قیمتی وقت کیسے برباد ہو گیا ہم اسے جان کر بھی انجان بنتے تھے۔ لیکن اس زیاں کا ہمیں کوئی احساس ہی نہیں۔ یہ زیاں دو چار گھنٹے کا بھی ہو سکتا ہے اور دو چار دن کا بھی۔

ریکارڈ بنانے اور لوگوں کے درمیان خود کو نمایاں (یا سرخرو) کرنے کی چاہ میں کچھ لوگ اس فیس بک پر طرح طرح کی احمقانہ حرکتیں کرتے ہیں۔ ایک واقعہ آپ بھی سن لیجئے۔ فیس بک پر لائکس حاصل کرنے کی دوڑ میں الجیریا کے ایک شخص نے اپنے بیٹے کی جان داؤ پر لگا دی۔ یوں تو وہ اکثر کچھ یونیک پوسٹ کرتا تھا لیکن ایک دن تو اس نے حد ہی کر دی۔ اس نے اپنے ہی چھوٹے بیٹے کو پندرہویں منزل یعنی کم و بیش ایک سو پچاس فٹ کی اونچائی پر لٹکا دیا۔ مزید یہ کہ اس نے اس کا ویڈیو بنا کر فیس بک پر اپ لوڈ کر دیا اور نیچے کیپشن لکھ کر یہ دھمکی دی کہ اگر اسے ایک ہزار لائکس نہیں ملے تو وہ اسے نیچے گرا دے گا۔ جیسے ہی اس کا یہ ویڈیو وائرل ہوا پولیس نے اسے گرفتار کر لیا اور اسے دو سال کی قید کی سزا ہوگئی۔ ادھر دوسری طرف ٹوئٹر پر دوسروں کو بلاک کرنے کے جرم میں سپر پاور امریکہ کے صدر ڈونالڈ ٹرمپ کو قانونی کارروائی کا سامنا کرنا پڑا۔ باوثوق ذرائع کے مطابق گزشتہ تیس برسوں میں ڈونالڈ ٹرمپ کو چار ہزار مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔ ابھی ایک اور حالیہ مقدمہ ان سات افراد کی طرف سے دائر کیا گیا جنہیں اختلاف رائے کی بنا پر ٹرمپ نے ٹوئٹر سے بلاک کر دیا تھا۔ ماہ ستمبر میں فیس بک پر سائبر حملہ ہوا۔ جس کے نتیجے میں پانچ کروڑ صارفین کے ڈیٹا چوری ہوئے تھے اور اب حالیہ حملے میں تین کروڑ صارفین کی تفصیلات کی چوری ہوئی ہے۔ سائبر کرائم کے بڑھتے اس رجحان پر تشویش کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ سماجی روابط کی معروف ویب سائٹس، فیس بک کے شریک بانی اور سربراہ مارک زکر برگ نے سوشل میڈیا نیٹ ورک کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ دلچسپی کی بنیاد پر اشتہارات دکھانا صارفین کا ڈیٹا بیچنے سے مختلف ہے۔ چنانچہ زکر برگ کے اس معاملے کو دبا دیا گیا۔

کہتے ہیں کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ سو کچھ ویسی ہی صورت حال اس وقت سامنے آئی جب ایپل (سافٹ ویئر کمپنی) نے ایسی ہی غلطی کے لیے صارفین سے معافی مانگی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس غلطی کا انکشاف ایک چودہ سال کے بچے نے کیا جو اپنے دوستوں کے ساتھ گروپ فیس ٹائمنگ کر رہا تھا اور اسے پتہ چلا کہ وہ اپنے اس دوست کی باتیں بھی سن سکتا ہے جس نے لائیو چاٹ کے لیے اس کی کال کو ریسیو نہیں کیا تھا۔ فیس بک کے مختلف تانے بانے میں واٹس ایپ، یوٹیوب، بلوٹوتھ، میسنجنگ، میسنجر اور ایپ ٹک ٹاک وغیرہ شامل ہیں۔ یہ موبائل کا انتہائی فحش ایپ ہے جس نے پوری دنیا میں بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔ ٹک ٹاک ایپ کو 150 ممالک میں ایک رپورٹ کے مطابق پانچ سو ملین لوگ استعمال کر رہے ہیں۔ کارزمانہ جتنا جتنا بنتا جائے بگڑتا جائے۔

ہمارے لیے خوشی کی بات یہ ہے کہ ہم اسے دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی استعمال کر رہے ہیں۔ اس سے ہمیں یک گونہ طمانیت کا احساس ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ ریختہ کی طرح اور بھی کئی دوسری سائٹس اردو میں ہیں اور فیس بک پر اردو جس قدر حاوی ہے وہ اپنے آپ میں بے مثال ہے۔

فیس بک کے سلسلے میں طرح طرح کی باتیں ہوتی رہی ہیں ان میں سے صرف ایک چیز جس سے ہمیں سردست مطلب ہے وہ یہ کہ فیس بک کو اردو میں کیا کہیں گے۔ کوئی اسے چہرہ کتاب کہتا ہے تو کوئی محبوب کا چہرہ یا کتابی چہرہ۔ کتابی چہرے سے موسوم کر کے اس میں اپنے محبوب کا عکس دیکھنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ فیس بک کا قریب ترین مطلب یا مفہوم یہی کتابی چہرہ ہے۔ بہت ساری دوسری اصطلاحات کی مانند اسے بھی اسی طرح رہنے دیا گیا یعنی یہ فیس بک ہی رہا۔ آج یہی فیس بک بڑے کام کی چیز ہے۔ واٹس ایپ اس کے شانہ بشانہ ایک اور کام کی چیز ہے۔ آپ جس طرح سڑک کنارے کھڑے ہو کر چاٹ کھاتے ہیں اور آپ کو ایسا کرتے ہوئے نہ حفظان صحت کا خیال رہتا ہے اور نہ تضیع اوقات کا۔ جب سڑک کنارے چاٹ کھانے پر پریشانی نہیں تو پھر گھر میں بیٹھ کر چیٹ کرنے میں کیا حرج ہے؟

البتہ آپ کو ہوشیار کر دینا ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہر کتابی چہرہ محبوب وفادار نہیں ہوتا یا ہر ہنستا ہوا نورانی چہرہ، خوبصورت چہرے کا کیا؟ جب کہ دوسری طرف ہم سے چاٹ کرنے والے کتابی چہرے کا کیا؟ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

دل کو دیکھو چہرہ نہ دیکھو، چہرے نے لاکھوں کو لوٹا، دل سچا اور چہرہ جھوٹا

ابرار رحمانی

آجکل کی فائل سے:

سہیل عظیم آبادی

غبارِ کارواں

اپنے بارے میں کچھ لکھنا شاید ہر ایک کے لیے کٹھن کام ہوتا ہوگا۔ میرے لیے تو ناممکن سا ہے کیونکہ ہر وقت یہ احساس ستاتا رہتا ہے کہ میں نے زندگی میں کوئی ایسا کام نہیں کیا جسے میں لکھوں اور لوگ پڑھیں۔ اگر اپنے بارے میں کچھ لکھنا ہوتا تو کبھی کچھ نہیں لکھتا لیکن لکھنا ان لوگوں کے بارے میں جن سے میں ملا ہوں۔ جن سے کچھ اثر لیا ہے یا زیادہ متاثر ہوا ہوں اور یہ کام قدرے آسان ہے۔

اس لحاظ سے میں خوش نصیب واقع ہوا ہوں کہ زندگی میں بہتوں سے اور طرح طرح کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا ہے۔ شاعروں اور ادیبوں سے بھی، سیاسی رہنماؤں سے بھی، وزیروں سے بھی، سرکاری افسروں سے بھی، تاجروں سے بھی، فلم ایکٹروں اور ڈائریکٹروں سے بھی، گانے والوں سے بھی، ساز بجانے والوں سے بھی، کرکٹ اور فٹبال کے کھلاڑیوں سے بھی اور بہار کے زمینداروں سے بھی، جو سارا دن بیٹھ کر فضول باتیں کرنے میں ضائع کر دیتے تھے۔ یا دوسروں کی زمین کسی طرح ہڑپ کرنے کے منصوبے بنایا کرتے تھے، جس سے بھی ملا اس کا اچھا یا برا اثر ضرور لیا ہے۔ کچھ لوگوں سے ملنے کا اثر وقتی طور پر ہوا اور کچھ لوگوں کا دیرپا کہ اب تک باقی ہے۔

میں اس مضمون میں صرف ادبی شخصیتوں کا ذکر کروں گا۔ یہ اس لیے بھی کہ میری اپنی چھوٹی سی شخصیت بھی ادبی ہے اور جو دو چار دس آدمی مجھے جانتے ہیں، اسی حیثیت سے جانتے ہیں۔

بہار میں چھوٹے چھوٹے زمینداروں کے اتنے گھرانے تھے کہ سب کی تعداد بتانا ناممکن سی بات ہے۔ ایسے ہی ایک گھرانے میں میں پیدا ہوا۔ یہ گھرانا دولت مند نہیں تھا۔ مگر دال روٹی سے خوش تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ استادوں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ لکھوں تو سب کے نام یاد کرنا مشکل ہو جائے۔ جب ضلع اسکول مظفر پور میں داخل ہوا تو پہلی ادبی شخصیت سے ملاقات ہوئی یہ بزرگ تھے علامہ جمیل مظہری کے والد بزرگوار مولوی سید خورشید حسن خورشید۔ بڑے عالم اور شاعر اور شفیق استاد۔ یہ اردو پڑھایا کرتے تھے۔ پڑھاتے کیا تھے اردو گھول کر پلایا کرتے تھے۔ ہر طالب علم کو اردو زبان اور ادب سے گہری دلچسپی لینا سکھا دیتے تھے۔ میں یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے سارے ساتھیوں میں جو اردو پڑھتے تھے، اردو سے زیادہ کسی دوسرے موضوع میں دلچسپی نہیں تھی۔ یہ دراصل خورشید صاحب کا کمال تھا۔ وہ اردو اس طرح پڑھاتے تھے کہ طالب علموں کی دلچسپی بڑھ جاتی تھی۔ دوسرے کسی استاد میں یہ خوبی نہ تھی وہ بس پڑھا دیا کرتے تھے لیکن ان میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ طالب علم کو صرف اپنے موضوع کا بندہ بنا لیں۔ خورشید صاحب اردو پڑھنے والے طالب علم کو اردو کا بندہ بنا لیتے تھے۔ خورشید صاحب بے حد نیک اور فرشتہ صفت انسان تھے۔ کبھی کسی کو ڈانٹتے تک نہیں تھے۔ ان کا ہر طالب علم اپنے کلاس کی ضرورتوں سے بہت زیادہ اردو جانتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ کلاس میں پڑھانے کے علاوہ لڑکوں کو اپنے پاس سے اچھی اچھی کتابیں پڑھنے کو دیا کرتے تھے۔ پڑھنے کے بعد سوالات کرتے تھے۔ کتاب کے بارے میں اس کی رائے پوچھتے تھے اور اس طرح اس میں تنقیدی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

خورشید صاحب مجھ پر خاص طور پر مہربان تھے۔ ایک تو اس لیے کہ ان کے کلاس میں آنے سے پہلے گھر پر میں نے بہت سی اردو کتابیں پڑھ لی تھیں۔ طلسم ہوش ربا سے لے کر راشد الخیری کے ناول تک سے مجھے شعر کہنے اور مشاعروں میں بھی شرکت کرنے کا شوق تھا۔ خورشید صاحب مشاعروں میں شرکت ضرور کرتے تھے لیکن میں نے انہیں کبھی پڑھتے ہوئے نہیں سنا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ علامہ جمیل مظہری جو اس وقت کالج کے طالب علم تھے اور اچھے شاعر تھے، مظفر پور اور اس سے باہر کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ ان کے چھوٹے بیٹے رضا کاظمی بھی اچھے شعر کہتے تھے اور مشاعروں میں پڑھتے تھے۔ انہیں اپنے بیٹوں کے ساتھ شعر پڑھنا پسند نہ تھا۔ بلکہ انہوں نے شعر کہنا بھی ترک کر دیا تھا محض شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح تک ان کا فکرِ سخن محدود رہ گیا تھا، بلکہ میرے سامنے ہی انہوں نے دوسروں کے کلام پر اصلاح دینا بھی ترک کر دیا تھا۔ ایک بار جب علامہ جمیل مظہری کلکتہ سے چھٹیوں میں آئے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم ان سے اصلاح لیا کرو، اور میں نے یہی کیا۔

خورشید صاحب کی شفقتوں کو زندگی بھر بھلایا نہیں جا سکتا۔ دراصل مجھے ادب سے دلچسپی ان کی شفقتوں کی وجہ سے ہوئی۔ انہی کی ہدایت پر انہی کے کتب خانے سے کتابیں لے کر میں نے پریم چند، سدرشن، نیاز اور دوسرے لکھنے والوں کے افسانے پڑھے۔ خورشید صاحب ہر افسانے کے بارے میں سوال کرتے تھے۔ پھر ان کی خوبیوں اور خامیوں کو بتاتے تھے۔ اس طرح میرے ادبی ذوق کی پرورش انہوں نے کی اور میں ساری زندگی انہیں بھول نہیں سکوں گا۔ دوسری ادبی شخصیت جس سے ملا اور متاثر ہوا اور اب تک ہوں وہ علامہ جمیل مظہری کی ہے۔ وہ میرے بڑے بھائی بھی ہیں اور گرو بھی۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ان سے میں نے جو سب سے قیمتی چیز حاصل کی وہ ہے آزاد خیالی، تنگ نظری اور تنگ دلی سے نجات۔ کوئی کچھ سمجھے میں اسے ان کی بہت بڑی دین سمجھتا ہوں اور اپنا سب سے قیمتی سرمایہ۔ یہ اثر جمیل صاحب کی شفقت کا ہے کہ ہر قسم کے تعصّبات کو دل اور دماغ سے نکال کر پھینک دینے میں کامیابی حاصل کر سکا۔ اس میں شک نہیں کہ اس سلسلے میں دوسروں سے بھی ضرور متاثر ہوا ہوں لیکن پہلا اثر جمیل صاحب ہی کا ہے اور اسی کو میرے اندازِ فکر کی بنیاد ماننا ہوگا۔ جمیل صاحب طالب علمی کے زمانے میں ہی اتنے آزاد خیال تھے اور مذہبی تعصّبات سے اتنے دور، بلکہ اس کے مخالف کہ ان کے کٹر قسم کے اعزا ان سے رنجیدہ رہتے تھے۔

1930 میں تعلیم کے سلسلے میں ہی کلکتہ بھیج دیا گیا۔ اس زمانے کا کلکتہ آج کا کلکتہ نہیں تھا۔ وہاں بنگالی کے علاوہ ہر زبان کے بہت سے شاعر اور ادیب موجود تھے۔ اردو والوں کا بڑا حلقہ تھا۔ مولانا آزاد، آغا حشر کاشمیری، خان بہادر رضا علی وحشت، نواب نصیر حسین خیال، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، مولانا شائق احمد عثمانی، پروفیسر ظاہر رضوی اور بہت سے نوجوان شاعر اور ادیب موجود تھے۔ کلکتہ کا اپنا ادبی ماحول تھا۔ ان سارے بزرگوں سے ملاقات علامہ جمیل مظہری کی وجہ سے ہوئی۔ ان میں سے ہر ایک مخصوص کردار کا حامل تھا، جس سے کسی حساس آدمی کے لیے اثر نہ لینا ناممکن سی بات تھی۔

باقی صفحہ 52 پر

کتب موصولہ

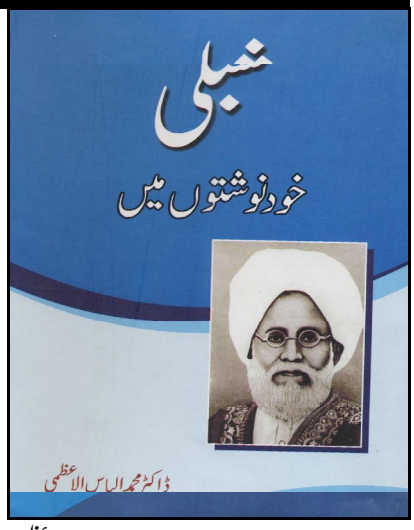

شبلی: خودنوشتوں میں مصنف: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
ملنے کا پتہ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

سیدسلیمان ندوی کا ترک وطن اسباب وحقائق
مصنف: سیدارشداسلم ناشر: روشان پرنٹرس، دہلی۔6

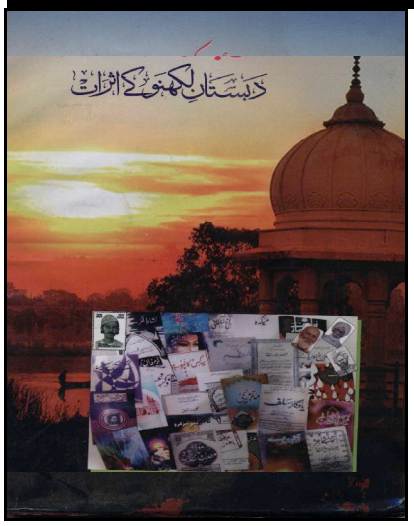

برھان پور کی اردو شاعری پر دبستان لکھنؤ کے اثرات
مصنف: ڈاکٹر عارف انصاری
ناشر: فاضلی اردو لٹریری اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، برہانپور

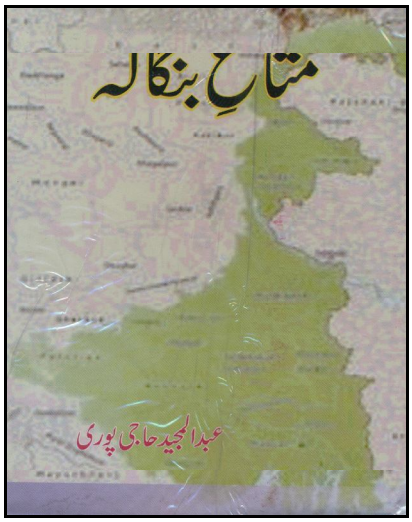

متاعِ بنگالہ مصنف: عبدالمجید حاجی پور
ناشر: روشان پرنٹرس، دہلی۔6

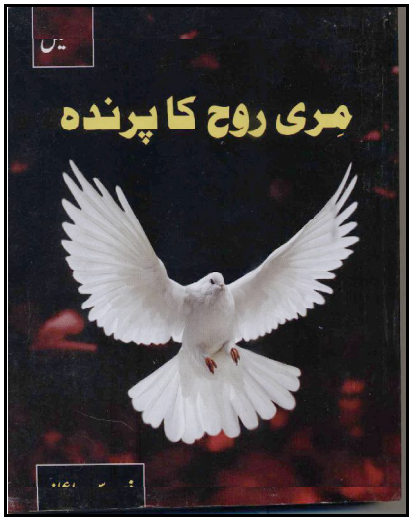

مری روح کا پرندہ مصنف: ف۔س۔اعجاز
ناشر: انشا پبلی کیشنز، B-25، زکریا اسٹریٹ، کولکاتا۔37

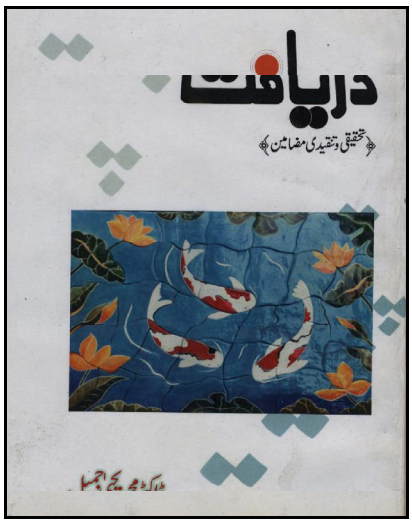

دریافت مصنف: ڈاکٹر محمد یحییٰ جمیل
ناشر: فاروق بک اسٹور، اتوارہ بازار، امراوتی۔444601

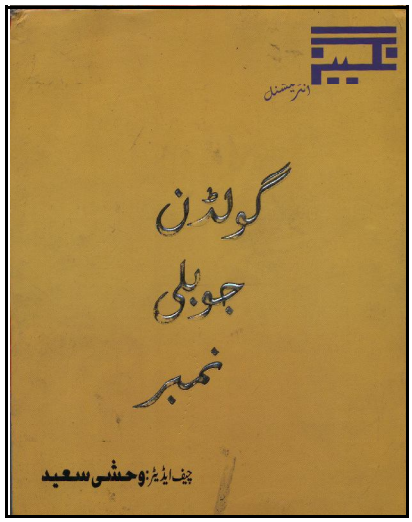

رسالہ: گولڈن جوبلی نمبر چیف ایڈیٹر: وحشی سعید
پرنٹنگ: الفجر پرنٹنگ پریس، سرینگر

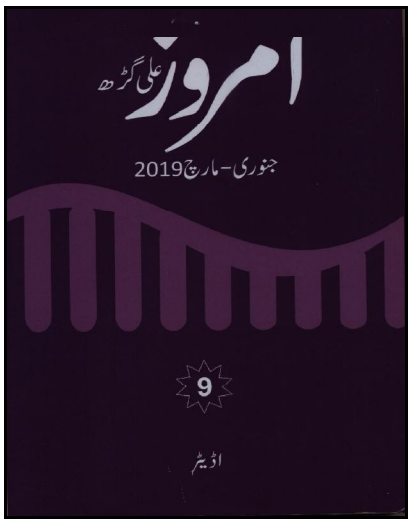

رسالہ: امروز ایڈیٹر ابوالکلام قاسمی
ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ

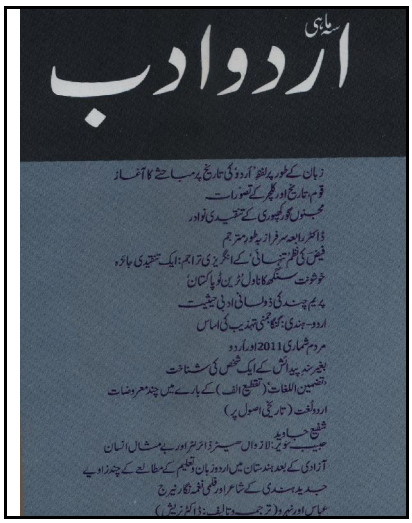

رسالہ: اردو ادب مدیر اعلیٰ: صدیق الرحمٰن قدوائی
ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، 212 راؤز ایونیو، نئی دہلی

Regd.No. D.L. (S)05/3198/2018-20
RNI No 948/57 (Delhi Post)
Date of Publication 12-13 February 2019
Date of Posting 15-16 February 2019

AAJKAL (Urdu)
Vol.77 No.08
March 2019

Licensed U (DN) 50/2018 - 20 to post
without pre-payment at RMS Delhi
Rs. 22/- Annual Rs. 230
ISSN 0971-846X

हमारे नए प्रकाशन

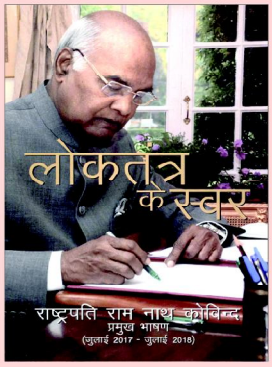

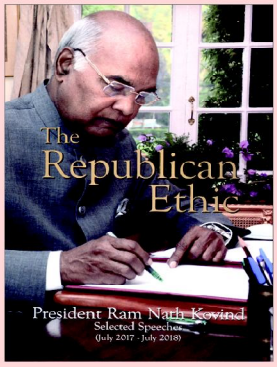

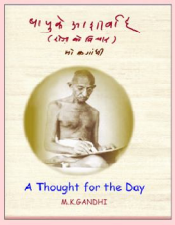

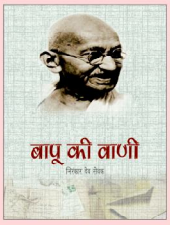

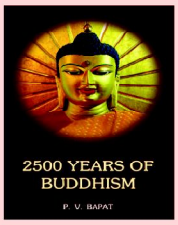

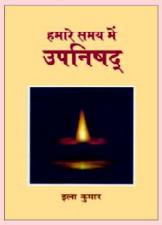

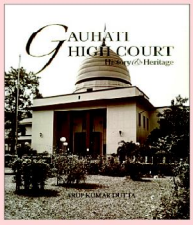

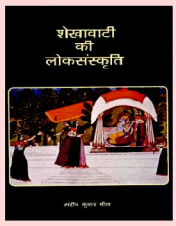

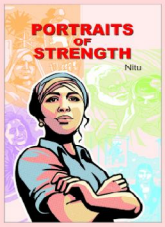

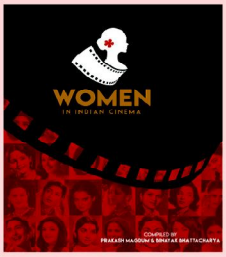

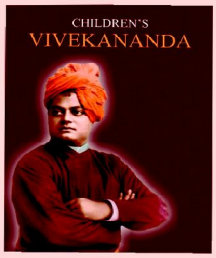

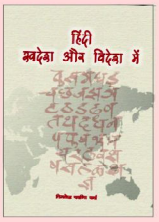

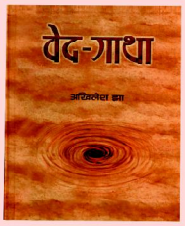

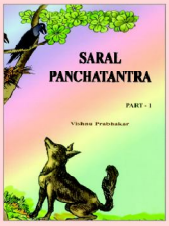

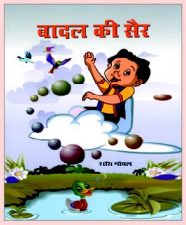

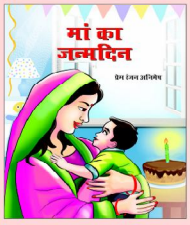

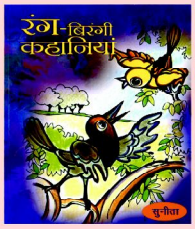

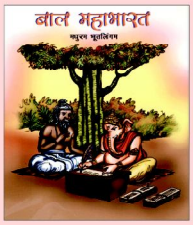

प्रकाशन विभाग
सूचना एवं प्रसारण मंत्रालय, भारत सरकार
सूचना भवन, सी जी ओ कॉम्प्लेक्स, लोधी रोड
नई दिल्ली -110003
वेबसाइट : www.publicationsdivision.nic.in

ऑर्डर के लिए संपर्क करें :
फोन : 011-24367260, 24365610
ई-मेल : businesswng@gmail.com
हमारी पुस्तकें ऑनलाइन खरीदने के लिए
कृपया www.bharatkosh.gov.in पर जाएं।
चुनिंदा ई-बुक एमेज़ॉन और गूगल प्ले पर उपलब्ध।

Follow us on twitter @ DPD_India

Printed and Published by **Dr. Sadhana Rout,** DG, Publications Division, Soochna Bhawan, C.G.O. Complex, Lodhi Road, New Delhi-110003 Printed at M/s I G Printers Pvt Ltd. 104,DSIDC Complex, Okhla Indl Area Phase I New Delhi. 110020 Senior Editor : **Hasan Zia**